تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

ممتاز مفتی کے افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا:
نفسیاتی نظریات کی روشنی میں

محقق

ثناء نورین

186-FLL/MSURDU/F16

نگران

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

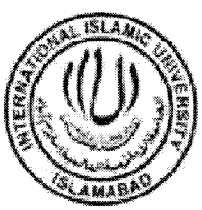

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

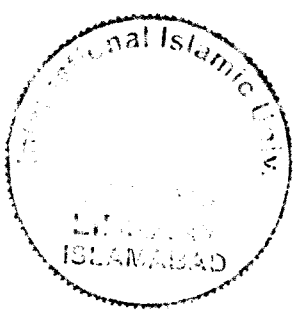

Accession No. TH23132

MS
891.4393
شان م

اردو ادب ۔ افسانہ

" " " ۔ تصویر عورت

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ ثناء نورین رجسٹریشن نمبر 186-FLL/MSURDU/F16 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **" ممتاز مفتی کے افسانوں میں تصور عورت کا ارتقا: نفسیاتی نظریات کی روشنی میں "** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Sana Noureen**

Title of the Thesis: ممتاز مفتی کے افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا: نفسیاتی نظریات کی روشنی میں

Registration No: **186-FLL/MSURD/F16**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Prof.Dr.Nadeem Aslam
Professor
Faculty of Language and Literature

Internal Examiner:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor,Department Of Urdu
Female IIUI

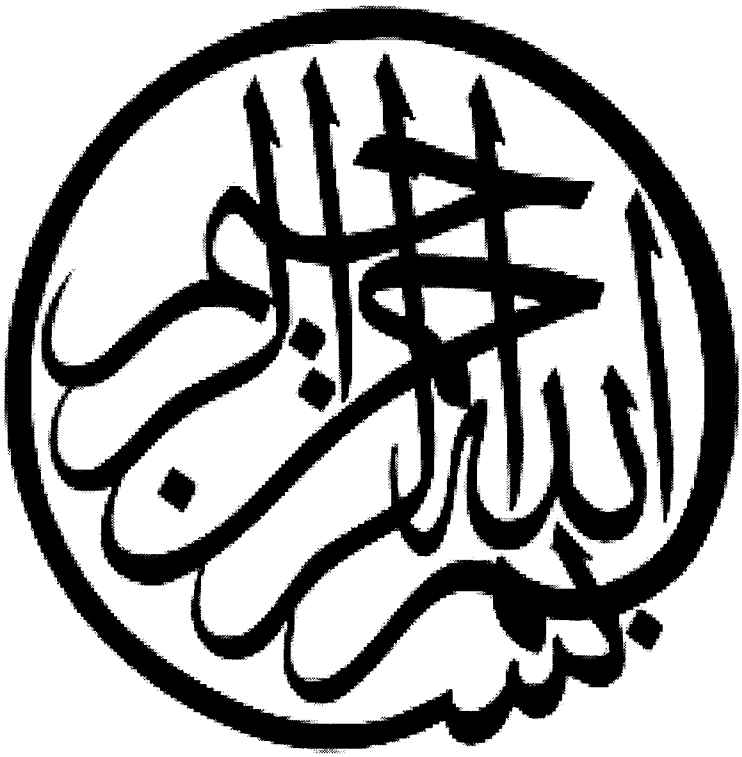
بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے۔ ابتدا ہی سے انسان کھوج کے عمل سے گزر رہا ہے۔ سماجی، معاشی اور مذہبی اقدار کو بنیاد بنا کر زندگی کی راہوں پر رواں دواں ہے۔ ابتدا سے آج تک انسان کا ارتقائی عمل جاری و ساری ہے۔ اس نے اپنے ارد گرد میں موجود چیزوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے نظریات قائم کیے۔ پھر مشاہدات سے گزر کر تجزیہ کیا اور اس جانچ پرکھ کے بعد وہ کسی نتیجے پر پہنچا۔ تجزیات و تجربات کے لیے اصول و ضوابط مقرر کیے۔ ایسے اصول جو انسانی عقل کو متاثر کرتے ہوں۔ انسان کی ترقی کا سفر لا محدود ہے۔ فلسفہ عقل و حکمت کی ایسی شاخ ہے جہاں سے علم فنون کے غنچے پھوٹتے ہیں۔ اس فکر و عمل کا مرکز انسان اور انسانی نفسیات ہے۔ انسانی نفسیات کو سمجھنے اور بات کرنے کے لیے پہلے فلسفۂ حیات سے آگاہی لازمی ہے۔ اسی طرح کسی معاشرے کی تشکیل کے لیے مرد و عورت کا وجود اہمیت کا حامل ہے۔ اگر بات صرف عورت ذات کی کی جائے تو یہ بات واضح ہے کہ عورت تخلیق کا ذریعہ ہے۔

یہ تحقیقی مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "اردو افسانے میں تصورِ عورت" ہے۔ یہ باب اردو افسانہ نگاروں کے ہاں عورت کے تصور اور اس کے ارتقا کو پیش کرتا ہے۔ کوئی بھی نوعیت ہو مذہب، ثقافت، رسم و رواج، معاشرتی رکاوٹیں، استحصال یا آزادیٔ نسواں عورت کو ہر موضوع کے حوالے سے موضوع بحث لایا جاتا رہا ہے۔

دوسرا باب "ممتاز مفتی کے افسانوں میں نظر آنے والے مختلف نفسیاتی نظریات" کا تعارف پیش کرتا ہے۔ کیسے مغربی نفسیات دانوں نے ہمارے اردو ادب پر اپنے نظریات و افکار سے متاثر کیا۔ مختلف مصنفین کی طرح ممتاز مفتی نے بھی مختلف ماہر نفسیات کا مطالعہ کیا اور اثر قبول کیا۔ سگمنڈ فرائڈ، یونگ، ایڈلر، دوستوفسکی وغیرہ کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ خاص طور پر سگمنڈ فرائڈ کا موضوع تحلیلِ نفسی اس ضمن میں اہم ہے۔

تیسرا باب "ممتاز مفتی کے پہلے دور کے منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا"۔ یہ باب مفتی صاحب کے افسانوں میں تصورِ عورت کے ارتقا سے متعلق بحث کرتا ہے۔ اس حوالے سے افسانوں میں مختلف نفسیاتی نظریات کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ چوتھا باب "دوسرے دور کے منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا نفسیاتی نظریات کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اس باب میں جدید اور قدیم عورت کے امتزاج کو نفسیاتی خیالات و نظریات کو مد نظر رکھ کر برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پانچواں باب محاصل ہے جس میں تمام مباحث کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس باب کے ذریعے پورے مقالے کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے اللہ عزوجل کی شکر گزار ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور

نہایت رحیم و کریم ہے۔ جس کے کرم کی بدولت آج میں اس قابل ہوئی اور علم ادب کے سمندر میں ایک قطرہ شامل کر سکی۔ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ میرے رب کی کرم نوازی سے میں مشکلات اور دشواریوں سے گزر کر تحقیقی مقالے کو تکمیل کے مراحل تک لا سکی۔ میں اپنی انتہائی قابل قدر اور قابل احترام محترمہ پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کی شکر گزار ہوں جنھوں نے ایم فل کے مقالے کے لیے موضوع کے انتخاب میں میری مدد کی۔ ان کی حوصلہ افزائی اور راہ کے تعین کی وجہ سے میں آج اس موضوع پر کام کر سکی۔

میں اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر غلام فریدہ کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور ہوں جنھوں نے اپنے نگران ہونے کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیئے اور ہر قدم پر میری رہنمائی اور معاونت کی۔ ان کی طرف سے یہ عنایت اور مدد میرے لیے بہت معاون ثابت ہوئی۔ محترمہ ڈاکٹر غلام فریدہ کے دوستانہ رویہ اور محبت کے لیے میں تہِ دل سے ان کی شکر گزار ہوں۔ اللہ پاک ان کو جزائے خیر عطا کرے۔ محترمہ ماریہ ترمذی صاحبہ کی بہت ممنوں ہوں جنھوں نے ایم فل کورس ورک کے دوران مجھے ہر طرح سے مدد فراہم کی۔ اللہ پاک ان کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔ اس کے علاوہ میں اپنے شعبۂ اردو کی تمام اساتذہ کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی موقع پر اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور حوصلہ افزائی کی۔ میں اپنی پیاری اور عزیز سہیلی ثنا اکبر کی مشکور ہوں جس نے اپنی دعاؤں اور محبتوں سے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ میں ہمارے شعبہ میں موجود محترم مختار احمد کے تعاون کی شکر گزار ہوں۔

میں اپنے شریکِ حیات اور روح کے ساتھی سجاد احمد کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے ہر لمحہ اپنے تعاون اور ساتھ کا احساس دلایا۔ جہاں جہاں مجھے مدد کی ضرورت ہوئی ہر قدم پر تعاون کیا۔ اپنی دعاؤں اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ اپنے بھائی کی شکر گزار ہوں جس نے میری ہمت اور حوصلہ بڑھایا۔ میری پیاری والدہ فہمیدہ اختر (مرحومہ) جواب اس دنیائے فانی میں موجود نہیں لیکن اللہ پاک کے بعد سب سے زیادہ میں اپنی امی جان کی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقام تک لانے کے لیے دن رات محنت کی اور اپنی انمول دعاؤں کا تحفہ دیتی رہیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور اپنا خاص فضل و کرم کرے۔ آمین۔

میں اپنے رب تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس ذاتِ باری نے مجھے اتنے اچھے اور چاہنے والے لوگوں سے نوازا۔

میں اپنا مقالہ اپنی امی جان (مرحومہ) کے نام کرتی ہوں جنھوں نے محبتوں، قربانیوں اور دعاؤں کا بیش بہا خزینہ عطا کیا۔

ثناء نورین

اکتوبر ۲۰۲۰ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	اردو افسانے میں تصورِ عورت	۱
۲۔	**باب دوم:**	
	ممتاز مفتی کے افسانوں میں موجود مختلف نفسیاتی نظریات	۲۳
۳۔	**باب سوم:**	
	ممتاز مفتی کے پہلے دور کے منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا (۱۹۳۶ء۔۱۹۶۵ء)	۴۷
۴۔	**باب چہارم:**	
	ساٹھ کی دہائی کے بعد کے منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا	۷۵
۴۔	**باب پنجم:**	
	ماحصل	۹۸
	کتابیات	۱۰۳

باب اوّل:

اردو افسانے میں تصورِ عورت

باب اوّل:

اردو افسانے میں تصورِ عورت

ادب انسانی زندگی کا ایک ایسا آئینہ ہے جس کے ذریعے سے ہم معاشرے کے مختلف رویوں کو دیکھتے اور ان پر اپنی انفرادی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ زندگی کے مختلف معاملات و مسائل، سماجی و معاشرتی رویوں اور تہذیبی افکار کی پرکھ کرنے کے ساتھ ساتھ ادب ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے سے تہذیبی رویوں، عقائد اور انسانی زندگی کے ذہنی و نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ معاشرہ اکائیوں سے جنم لیتا ہے، تاہم ہر اکائی کا اپنا انفرادی انداز اور طریقہ کار ہوتا ہے جس کے ذریعے سے وہ معاملاتِ زندگی کو برتنے اور ان پر ردِ عمل کا اظہار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان ہی اکائیوں میں وہ لکھاری بھی شمار ہوتے ہیں جو ادب کے ذریعے اپنے تجربات و محسوسات اور خیالات کو لفظوں کے قالب میں ڈھال کر ناولوں، افسانوں اور کہانیوں کا روپ دیتے ہیں۔

یوں تو ہر مصنف کے خیالات و تصورات مختلف موضوعات کے گرد گھومتے ہیں مگر بات عورت کی ہو تو یہ صنف ہمیشہ سے ہی ہر لکھنے والے کا پسندیدہ موضوع رہی ہے۔ لکھنے والوں نے عورت سے متعلق اپنے احساسات، خیالات، جذبات اور تجربات کو مختلف انداز میں پیش کیا۔ کیسی بھی نوعیت ہو، چاہے مذہب، ثقافت، تہذیب و روایت، رسم و رواج، معاشرتی و معاشی رکاوٹیں، معاشرتی استحصال یا آزادیِ نسواں الغرض عورت کو ہر حوالے سے زیرِ بحث لایا جاتا رہا ہے۔

معاشرہ تنہا مرد سے نہیں چلتا بلکہ عورت اور مرد دونوں معاشرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مرد عورت کے بغیر ادھورا ہے اور عورت مرد کے بِنا نامکمل ہے۔ یہی نہیں بلکہ عورت ہی سے نسلِ انسانی اور اس کی بقا ممکن ہے۔ محمد اجمل لکھتے ہیں:

> حوّا کی تخلیق بنی آدم کی افزائش اور رنگینیِ کونین کا باعث بنی۔ مردوں نے عورت کے حسن و جمال کے قصیدے لکھے۔ اس کی جھلک دیکھنے، اُس کی خوش نودی حاصل کرنے اور لذتِ وصال پانے کے لیے اپنے سروں کے نذرانے پیش کیے۔ نئی ایجادات اور لازوال شاہکار کی تخلیق کا باعث بھی عورت بنی۔[1]

مرد اور عورت ایک دوسرے کے بنا ادھورے ہیں۔ اس لیے نظامِ کائنات اور نظامِ تمدن میں دو فریقین کا برابر حصہ ہے۔ ایک بھی فریق اپنی ذمہ داری سے ہٹے تو کائنات کا سارا نظام مفلوج ہو جائے۔ اس لیے صرف مرد کو اہم، برتر اور عقلِ کل ثابت کرنا فطرت کی منشا کے خلاف ہے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

> مرد اپنی الجھنوں کو عورت کی اعانت کے بغیر نہیں سلجھا سکتا کیوں کہ روپے کے چاہے دو رُخ ہوں، روپیہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ یہ جب بھی Devaluate ہوتا ہے تو اس کے دونوں رُخ ایک وقت میں بے حیثیت ہو جاتے ہیں۔[۲]

تہذیب و تمدن اور قوموں کے عروج و زوال میں عورت کی معاشرتی ترقی یا تنزل کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ اگر ہم عورت کو محض اکتسابِ لذت کا ذریعہ، مرد کے جذبۂ شہوانیت کی تسکین اور بچے پیدا کرنے والی مشین سے زیادہ اہمیت نہ دیں گے تو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

عورت نے تہذیب و تمدن کی ترقی میں نہ صرف خود فعال کردار ادا کیا ہے بلکہ مرد کی فعالیت میں بھی ایک زبردست محرک کے طور پر کام کیا ہے۔ تمام مذاہب کے برعکس اسلام نے عورت کو عزو شرف کے قابل سمجھا۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

> اسلام نے عورت کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیے ہیں اور عزت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں اور ان حقوق و مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائیدار ضمانتیں مہیا کی ہیں ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظامِ معاشرت میں نہیں ملتی۔[۳]

دنیا کی کسی بھی زبان کا ادب عورت کے موضوع سے خالی نہیں۔ عورت کا وجود ادبی دنیا میں ہر طرف موجود ہے۔ داستان ہو، ناول ہو یا افسانہ عورت کے موضوع کے بنا ادھورا ہے۔ ہر موضوع قدامت کے ساتھ وسعت لیے ہوئے ہے۔ عورت انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ ہندوستانی عورت کے سارے رنگ داستانوں میں موجود ہیں۔

کہیں شعراء عورت کو موضوعِ سخن بناتے ہیں تو کہیں عورت کسی کے ساز کی دھن بنتی ہے۔ کسی مثنوی کی

شہزادی ہو یا کسی ناول یا افسانے کا مرکزی کردار عورت ہی سے تحریروں کو جلا بخشی جاتی ہے۔ اردو ادب میں عورت کے موضوع سے داستانوں کو فروغ حاصل ہوا۔ داستان ہو، ناول ہو، افسانہ ہو یا کوئی اور کہانی، عورت کے تذکرے کے بنا ادھوری ہے۔ عورت کے وجود کو زندگی کی بہار سمجھا جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں عورت کی اہمیت و مقام سے انکار ممکن نہیں۔ غلام اکبر ملک لکھتے ہیں:

> بساطِ زیست سے عورت کا وجود اٹھا لیا جائے تو رنگ و بو کی یہ حسین دنیا محض معمورۂ خاک بن کر رہ جائے گی۔[۴]

ابتدائی ادبی دور میں عورت کو داستانوں میں اس انداز سے پیش کیا جاتا تھا جس کے کوئی احساسات، جذبات، خیالات اور نفسی مسائل نہیں بلکہ وہ صرف مردوں کے دل کو لبھانے کا ایک خوبصورت کھلونا ہے۔ لیکن بعد میں لکھی جانے والی داستانوں میں عورت کو ایک مختلف روپ میں دکھایا گیا۔ اس کی مثال میر امن کی باغ و بہار ہے جس کے ذریعے عورت کا مضبوط کردار سامنے آتا ہے۔ جذبۂ محبت ہو یا جذبۂ رقابت و حسد یا باوفا دیوی کا کردار عورت کے تمام احساسات و جذبات اس داستان میں نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم درانی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> باغ و بہار کے نسوانی کردار زیادہ روشن، زیادہ دلکش، زیادہ فعال، زیادہ زندگی آمیز ہیں۔ شہزادیاں باوفا جرأت مند، عالی، باحوصلہ، نڈر، ذہین، ہوشیار ہیں..... وہ جنسی حوالے سے بہت مغلوب ہو جاتی ہیں۔ یوں وہ والدین کی نیک نامی کو ٹھکرا کر اپنے عشاق کے پہلو میں گر جاتی ہیں۔[۵]

۱۸۵۷ء کے بعد جب برصغیر کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہوا تو اس نے لکھنے والوں پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ادیبوں کی تخیلاتی اور رنگ بھری سوچ نے پرواز کی اور اس کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ موضوعات تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ حقائق اور مقصدیت نے لے لی۔ اس کے ابتدائی نقوش کا سرا علی گڑھ سے جا ملتا ہے۔ اس کی مثال ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃ العروس اور فسانۂ مبتلا ہیں۔ ان ناولوں میں موضوع عورت کو ہی بنایا گیا ہے۔ انہی لکھنے والوں میں ایک نام مرزا ہادی رسوا کا ہے جنھوں نے ناول امراؤ جان ادا تخلیق کیا۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی ایک عورت ہی ہے۔

وقت جوں جوں آگے بڑھتا گیا اسی طرح پڑھنے والوں کی دلچسپی طویل داستانوں اور ضخیم ناولوں میں کم ہوتی گئی۔ تیز رفتار دور میں داستان اور ضخیم ناولوں کو پڑھنے کے لیے وقت کی کمی آڑے آگئی۔ اب لوگوں کی دلچسپی محدود ہو گئی۔ لکھنے والوں نے بھی حالات کے موافق موضوعات کو سکیڑنا شروع کر دیا۔ کہانیاں موضوعات، واقعات مختصر ہوتے گئے۔ یہی دور افسانے کی ابتدا ثابت ہوا۔

اردو افسانہ نگاری کا آغاز اور تصورِ عورت:

اردو میں افسانہ نگاری کا فن بھی مغرب سے ہمارے ہاں مروج ہوا، مگر یہ صنف مشرقی تہذیب میں اس طرح گھل مل گئی کہ اس پر مغربی صنف کا گمان نہیں ہوتا۔ چونکہ اردو میں داستان، ناول، کہانی، حکایت جیسی نثری اصناف پہلے ہی سے موجود تھیں۔ برصغیر میں اردو افسانے کی ابتدا بیسویں صدی میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پوری دنیا میں حقوقِ نسواں کے لیے مختلف آوازیں سر اٹھا رہی تھیں۔ یہی تحریک ادیبوں کے سکوت کو توڑنے کا سبب بنی یوں عورت کے کردار کو اردو افسانے میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔

ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں پہلا نام علامہ راشد الخیری کا ہے۔ اس ضمن میں ان کا پہلا افسانہ نصیر اور خدیجہ ہے۔ علامہ راشد الخیری کے افسانوں میں عورت ایک مرکزی حیثیت سے ابھری ہے۔ عورت کو درپیش مسائل، مشکلات اور تکالیف جیسے موضوعات کو انھوں نے افسانوں کا حصہ بنایا۔

ہندوستانی عورت کے مسائل اور تکالیف کو علامہ راشد الخیری نے نہایت خوب صورتی سے اپنے افسانوں میں برتا ہے جو پڑھنے والوں کے دل کو چھو لیتا ہے۔

علامہ راشد الخیری کے افسانوں کی عورت معاشی اور سماجی الجھنوں کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کی ستائی ہوئی اور مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ ان کے افسانوں کی عورت غم زدہ اور افسردہ ہے۔ علامہ راشد الخیری کو "تصورِ غم" کا لقب بھی دیا گیا ہے۔

علامہ راشد الخیری کے بعد افسانوی ادب کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کا نام

نمایاں ہے۔ یہی ادیب افسانہ نگاری کے بانی کہلائے جاتے ہیں۔ ریحان حسن لکھتے ہیں:

> افسانہ نگاری کی ابتدا میں ہمیں اصلاحی اور روحانی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے جس میں اصلاحی میلان کے علمبردار پریم چند تھے جو اپنے افسانوں کے ذریعے کسی نہ کسی معاشرتی پہلو کی اصلاح کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے علاوہ افسانے کی تہہ میں اصلاحی رنگ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، حکیم احمد شجاع، سلطان حیدر، جوش، حجاب امتیاز علی اور مجنوں گورکھ پوری کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔[۶]

یلدرم کا نام اردو افسانہ نگاری میں اوّلیت کا حامل ہے۔ انھوں نے افسانے کو رومانوی مزاج اور رنگینی مزاج سے روشناس کروایا۔ یلدرم نے عورت کو تسکین، خوشی اور لطافت کا منبع بنا کر پیش کیا۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ "خارستان اور گلستان" ہے جس میں عورت کو رومانویت اور لطافت کے انداز میں پیش کیا گیا۔ عورت کی آزادیٔ اظہار اور اس کے مسائل کے لیے آواز اٹھانا یلدرم کا ایک منفرد اندازِ بیان ہے۔ اس کی مثال ان کے افسانے ازواج محبت میں ملتی ہے۔

اسی دور میں اپنے الگ، منفرد انداز اور حقیقی موضوعات کو لے کر ابھرنے والے افسانہ نگار پریم چند ہیں۔ ان کا یہ خاصا ہے کہ انھوں نے فکری اور فنی سطح پر پختگی کا تخلیقی اظہار کیا جس نے آنے والے دور میں افسانہ پر دُور رس اور گہرے اثرات مرتب کیے۔ پریم چند نے مقصدیت کو موضوع تحریر بنایا۔ انھوں نے معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی۔

ہندوستانی معاشرے میں عورت کے ساتھ برتا جانے والا روّیہ، عورت کا استحصال، مسائل و مشکلات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ پریم چند کی افسانہ نگاری فکری و فنی حیثیت سے اردو میں ایک نئی چیز ہے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی الگ ہے۔ پریم چند نے ہماری اپنی زندگی کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ اردو افسانے میں واقعیت اور حقیقت نگاری کو رواج دیا۔

اردو افسانے میں حقیقت نگاری اور رومانویت کے رجحان کے ساتھ ساتھ اچانک انگـــــارے کے نام سے مجموعہ منظر عام پر آیا اور ایک تہلکہ خیز دور کا آغاز ہوا۔ اس اشاعت نے ادب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ارتعاش پیدا

کیا۔ اس سے معاشرے میں بغاوت کی بُو آنے لگی۔ نام نہاد اقرار و روایت، جاگیر دارانہ اور طبقاتی تفریق میں ہلچل مچ گئی۔ اس مجموعے کی تحریریں مرد کے ناروا سلوک، عورت کے جنسی استحصال، معاشرتی دباؤ اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتی رہیں۔ بظاہر عورت کے حقوق کی بات تو بہت سے لکھاریوں کے ہاں سامنے آتی ہے لیکن عورت کی مکمل نمائندگی کوئی بھی نہیں کرتا۔ ماسوائے خواتین لکھاریوں کے جو عورت کے حقوق، اس کے جذبات و احساسات اور اس پر بیتنے والے واقعات کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ حمیرا اشفاق لکھتی ہیں:

> اردو ادب میں خواتین کے بارے میں علامہ راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد، حالی اور دیگر لوگ بھی لکھ رہے تھے۔ پھر اس کے بعد ادب کے اُفق پر اہلِ قلم خواتین بھی اُبھریں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے شعورِ نسواں کے مسائل اور سماج کو مرد کی آنکھ سے نہیں بلکہ ایک عورت کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ خواتین کے رسائل "تہذیب نسواں"، "عصمت" بھی ان کی فکر کے عکاس تھے۔ شیخ عبداللہ اور بیگم عبداللہ بھی رسالہ "خاتون" شائع کر رہے تھے۔[۷]

انگارے کی پر تعاش تحریروں نے اردو ادب کو متاثر کیا تھا۔ یہ تحریریں لکھنے والوں میں ایک نام ڈاکٹر رشید جہاں کا بھی ہے۔ جنھوں نے عورت کے معاشرتی استحصال، اس کو درپیش مسائل و مشکلات کا بہتر طور پر اظہار کیا۔ کیسے ایک عورت معاشرتی مسائل سے دوچار ہو کر اپنے احساسات اور جذبات کا گلا گھونٹ کر زندگی بسر کرتی ہے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

> مرد کے تعصبات اور اس کے ساختہ قانون نے عورت کو عرصہ تک معاشرے میں پس ماندہ شہری کی حیثیت دی۔ کہیں وہ جائیداد کی شکل میں غلام تھی، کہیں معاشرے میں گلدان کی طرح نمائشی چیز تھی۔ کچھ نے انھیں جنسی لذت کا سمبل بنا رکھا تھا۔[۸]

رشید جہاں عورت کے حق کے لیے ایک مضبوط آواز بن کر سامنے آئیں۔ انھوں نے کھل کر اور بہت بہترین انداز میں حقوقِ نسواں کی بات کی۔ اس میں چاہے عورت کے معاشی و معاشرتی مسائل ہوں یا اس کی جسمانی تکالیف الغرض عورت سے وابستہ ہر موضوع کی کھل کر ترجمانی کی۔

جہاں اور بہت سے لوگوں نے عورت کو موضوعِ تحریر بنایا وہیں ایک اہم نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ منٹو کے افسانے زیادہ تر جنسی موضوعات کی گرد گھومتے ہیں۔ لیکن منٹو نے جنس کے موضوع کو بہت خوب صورتی سے برتا ہے۔ بظاہر ایک چلچلاتی دھوپ اور روشنی کے پیچھے جذبات کے قتل و خون اور اندھیرے کو اپنی تحریروں میں دکھایا ہے۔

صغریٰ مہدی کا شمار ان ناول نگار خواتین میں ہوتا ہے جو محقق، استاد اور ادیبہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں تجربہ و تحلیل کے بعد سماجی عوامل کی عکاسی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں عورت کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے جدید عورت کو اپنی شناخت کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے دکھایا۔ عورت کی علیحدہ شناخت سے جڑے ہوئے مسائل کو پیش کیا۔ انھوں نے ایک ایسی عورت دکھائی ہے جو اپنی پہچان کی جستجو میں محوِ گرداں ہے اور سماجی عمل میں درپیش مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کے تحریروں سے ہندوستانی معاشرے میں عورت کے مجبوری اور بے بسی ظاہر ہوتی ہے۔

جمیلہ ہاشمی کی تحریروں میں عورت کا جو تصور ہے وہ اس مردانہ سماج کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہے۔ اس پر پرانی رسم و رواج اور جبلتیں، رواج کی بندشیں دکھائی دیتی ہیں۔ عورت کی مرضی اور منشا کے بغیر شادی، لڑکیوں کی خرید و فروخت جیسے موضوعات کا احاطہ کیا۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں عورت کے اخلاقی، جسمانی استحصال اور مظلومیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول روہی اسی موضوع سے متعلق ہے۔

سائرہ ہاشمی نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورت کی ایسی زندگی کو واضح کیا ہے جس سے وہ مشرقی اور مغربی دونوں طرح کے مردوں کے ذریعے ہونے والے عورت کے جنسی استحصال پر بات کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مردانہ استحصال اور گھٹن دونوں معاشروں میں موجود ہے۔ سیاہ برف ایک ایسی ہی کہانی ہے جو عورت آزاد خیال، سماج کی گھٹن اور مردانہ استحصال کے خلاف جدوجہد کرتی ہے۔

علیم مسرور نے اپنی تحریر کردہ کہانی بہت دیر کر دی میں ایک ایسی عورت کا تصور پیش کیا ہے جو مرد زدہ سماج میں مرد کا دل بہلانے، عیش و عشرت اور اس کی خواہشات کو پورا کرنے کا باعث ہے۔ علم مسرت نے مرد و

عورت کے نفسیاتی اور جنسی مسائل پر روشنی ڈالی ہے ایسی ایک عورت جو اپنی معاشی مجبوریوں کے زیرِ اثر ہے مرد کے سامنے کس قدر بے بس ہے۔

منٹو نے زندگی کی دلکشی اور رعنائیوں کی آڑ میں موجود نفسیاتی الجھنوں، زخمی روح، زندگی کی اذیتوں کی چبھن کو آنکھوں میں سمویا ہے۔ کیسے بظاہر ایسی عورت جو دوسروں کو ہنساتی، لبھاتی اور جذبات کو گرماتی ہے اندر سے خود اذیتی اور بے بسی سے بے حال ہے۔

منٹو کے افسانوں میں موذیل، ہتک، ممّی، کالی شلوار اور اس طرح کے کئی افسانے شامل ہیں جن میں منٹو نے عورت کے طوائف کے روپ کو پیش کیا ہے۔ موذیل اس حوالے سے بہت اہم افسانہ ہے۔ ڈاکٹر انور احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> موذیل' درحقیقت کرداری افسانہ ہے اور ممّی "جانکی" اور "شادرا" سے بھی بڑا کردار ہے۔ جانکی، شادرا اور ممی کے لیے محبت اور ممتا کی شہادت جان سے تو نہیں دیتے جبکہ "موذیل" ترلوچن سنگھ (ایک اور سکھ کردار) کے لیے یہ کر گزرتی ہے۔ ترلوچن، موذیل کی خاطر کیس کٹوا دیتا ہے مگر پگڑی نہیں اُتارتا۔[9]

منٹو کے ساتھ ساتھ اس وقت لکھنے والوں میں راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے نام انتہائی اہم ہیں۔ منٹو جنسی نفسیات، کرشن چندر رومانویت پسند اور بیدی حقیقت نگاری کے انداز میں عورتوں کے حقوق کی بات اپنے افسانوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ بیدی حالانکہ حقیقت نگار تھے لیکن ان کے افسانوں میں تانیثی رنگ جابجا دکھائی دیتا ہے۔ بیدی کے ہاں عورت باکردار اور مکمل طور پر مشرقی لبادہ اوڑھے ہوئے نظر آتی ہے۔ اسی طرح کرشن چندر کے افسانوں کی رومانیت زندگی سے فرار اور موت کی آرزو نہیں کرتی بلکہ زندگی کو بدلنے کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں کی عمارت فطرت کے حسین مناظر، روایت کے خلاف بغاوت، طبقاتی تضادات، نفسیاتی الجھنوں اور مرد و عورت کے باہمی تعلق پر استوار ہے۔ اس ضمن میں کرشن چندر کے افسانے پانی کا درخت اور پریتو انتہائی اہم ہیں۔ منٹو، بیدی اور کرشن چندر افسانوی دنیا کی تثلیث ہیں۔

بیدی نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور حوادث کی بنیاد پر اپنے افسانوں کی عمارت تعمیر کی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ہاں عورت کو بہت زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔ لاجونتی میں تقسیم کے سانحے کی شکار مغویہ عورت کی نفسیات، نازک جذبات، مجروح احساسات اور سماج کی ظاہر داری کی کہانی ہے۔ بیدی نے خاص فکری رجحان، ہندوستانی تصورِ عورت، عورت کے نفسیاتی مسائل، عورت کے استحصال، خاندانی رویوں، معاشرتی بے حسی اور معاشرتی مظالم کو موضوع بنایا ہے۔

ان کے افسانوں میں عورت کے متعلق ڈاکٹر آنسہ احمد سعید لکھتی ہیں کہ :

> نسوانی زندگی بیدی کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ ان کے ہاں کرشن چندر کی طرح عورت کا ایک بڑا پاکیزہ اور لطیف تصور ملتا ہے۔ لیکن کرشن چندر کے ہاں عورت سرتاپا حسن ہے اور بیدی کے ہاں مجسم سیرت، کرشن چندر کی نظر اس کے جسم پر ہے اور بیدی انسانی رشتوں کے پسِ منظر میں اس کی سیرت کے حسن کو اجاگر کرتے ہیں۔ بیدی نے جس عورت کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ وہ عورت جو محبت کرنا چاہتی ہے مگر احتجاج بلند نہیں کرتی تاکہ قدیم روایات کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ گویا سر تسلیم خم کرنے میں ہی عورت کی نجات ہے۔ اس کے علاوہ لاجونتی، درشتی اور ہولی کے کردار بھی جان دار ہیں۔ اپنے دکھ مجھے دے دو کی "اندو" نازک رشتوں میں بندھی روایتی ہندوستان کی عورت کی سچی تصویر ہے۔[۱۰]

بیدی کے افسانوں کی عورت محبت سے گندھی ہوئی ہے، جو اپنے رشتوں کی اہمیت کو جانتے ہوئے محبت کا والہانہ اظہار کرتی ہے اور ضروریات زندگی کو اہمیت دیتی ہے۔ بیدی کے ہاں عورت ایک باکردار وصف کی حامل ہے جو اپنی محبت کو اپنوں میں تقسیم کرتی چلی جاتی ہے۔

انور سجاد کے ہاں عورت کا تصور مردانہ سماج میں ہر سطح پر اس کے استحصال کا شکار نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر جنم روپ میں بتایا ہے کہ عورت کو محض جنسی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، کس طرح عورت کے جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے۔ عورت جو اپنے خوابوں، تمناؤں اور خواہشوں کے مطابق زندگی بسر کرنے

کے خواہاں ہے۔اسے کس طرح آج بھی رسم ورواج اور روایتوں کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔انور سجاد نے عورتوں کے جنسی استحصال اور فکر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں موجود عورت خارجیت سے زیادہ باطنیت پرست دکھائی دیتی ہے جو باطن سے آگاہ ہونے کا ثبوت ہے۔ عورت کو اپنی ذات سے مکمل آگاہی اور شعور کا ادراک ہے۔ان کے افسانوں میں تصور کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ان کا افسانہ الاؤ بھی اس کی ایک مثال ہے۔

رشید امجد کے ہاں جو عورت موضوعِ تحریر ہے وہ خوب صورت، دل نشین، زندگی سے بھرپور ہے بلکہ ان کے افسانوں میں عورت کو ایک بوجھ سمجھا گیا ہے، جیسے بیٹی کی شکل میں جہیز کا بوجھ جنسِ مؤنث کا ہونا گھر کے مرد کے لیے ایسا بوجھ جس کے سر پر ہوس کا گدھ منڈلا رہا ہو۔

مظہر الاسلام کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے وجودیت کے زیرِ اثر بہت سے افسانے تحریر کیے۔ان کے ہاں عورت وفا، ممتا اور قربانی دینے جیسے اوصاف سے محروم اور تنہائی کا شکار ہے۔ان کے افسانوں کی عورت خوشیوں کی خواہاں اور اداسی سے اجتناب برتتی نظر آتی ہے۔

احمد جاوید نے اپنے معاشرے میں موجود حبس، گھٹن، ذہنی و نفسیاتی دباؤ اور جھنجھلاہٹ کو افسانوں کا موضوع بنایا، رات کی رانی کے افسانوں میں نفسیاتی الجھنوں، سوچوں، دلی کیفیات، اندرونی انتشار، خلفشار اور بیرونی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

اردو افسانے میں عورت بطورِ موضوع بہت سے لکھاریوں کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر عورت پر سب سے زیادہ کھل کر بات خواتین لکھاریوں نے ہی کی ہے۔اس حوالے سے عصمت چغتائی ایک اہم کڑی ہیں۔انھوں نے عورت کے لیے وضع کردہ ایسے تمام اصول خواہ وہ نام نہاد ہوں یا رسوم ورواج سے تعلق رکھتے ہوں سماجی ہوں یا ادبی تمام سے بغاوت کرتے ہوئے ان کو کچل ڈالا۔ عصمت کے ہاں رشید جہاں سے زیادہ جذباتیت اور بغاوت کا عنصر نمایاں ہے۔اس حوالے سے عصمت کا افسانہ عورت بہترین مثال ہے۔ یہ افسانہ پوری طرح عورت کے گرد گھومتا ہے۔ اس سے مشرقی تہذیب کی عکاسی بہتر طور پر ہوتی ہے۔اس میں مشرقی سیاق وسباق کے حوالے سے مردوں کے بارے

میں عورتوں کے خیالات، جذبات اور احساسات کو لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے عصمت چغتائی کے ہاں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے عورت، کو عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم میں برابر کا شریک کہا ہے۔ انھوں نے اس بات کو باور کرایا کہ جتنا مرد نے عورت کے بارے میں کہا عورت کو بھی چاہیے تھا کہ وہ مردوں کے بارے میں رائے دیں۔ یعنی الفاظ کے ذریعے عورت کو ذہنی طور پر اتنا معذول اور محدود کر دیا جاتا ہے کہ وہ آگے کچھ سوچ نہیں سکتی۔ افسانہ عورت میں عصمت کچھ اس طرح لکھتی ہیں:

> مردوں نے کہا مرد ظالم ہوتا ہے۔ وہ چپ چاپ سہنے لگیں مردوں نے کہا عورت ڈرپوک ہوتی ہے وہ چوہیا سے ڈرنے لگیں۔ پھر فرمایا..... وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل جاتی ہے۔ بس پھٹ سے جان پر کھیل گئیں۔[11]

عصمت کو سب سے زیادہ شہرت افسانہ لحاف سے ملی۔ ایک طرف ناموری تو دوسری طرف ادبی دنیا میں بدنامی کا وار بھی سہنا پڑا۔ یہ افسانہ ایسے وقت لکھا گیا جب معاشرے میں ادب پر لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جو نام نہاد روایات کا پابند تھا۔ اس افسانے کا موضوع جنس ہے۔ یہ افسانہ پردہ نشین عورتوں میں موجود ہم جنسیت کی جانب رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس حوالے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> نسائی ہم جنسیت ہمارے ماحول کے لیے اور ریختی کی صورت میں ادب کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ پھر اس پر جو کہرام مچا اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ بہر حال افسانہ اپنے موضوع اور اظہار کے لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ ہندوستان کی عورت کا وہ روپ دکھاتا ہے جو بالعموم لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اس میں وہ بیگمات عریاں ہوتی ہیں جو سو پردوں میں مستور ہیں مگر پابند نہیں! بیگم جان کے روپ میں وہ بے شمار عورتیں ہیں جو کچلی ہوئی جنسیت کی بنا پر ہم جنسیت کو شکار بنا لیتی ہیں۔ اسے غرض یا گناہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ ہم جنسیت جنس اتنی ہی قدیم ہے۔[12]

بیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والی خواتین لکھاریوں نے نوجوان لڑکیوں کے خوابوں اور گھریلو ماحول کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان باشعور خواتین نے جادو ٹونے اور بھوت پریت سے نکل کر عام زندگی میں عورت کے حالات اور ماحول کی الگ پہچان کو برقرار رکھا۔ عورت کی نمائندہ بن کر عورت کے مسائل و مشکلات کی عکاسی کی۔ ان

خواتین میں عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور نمایاں افسانہ نگار ہیں۔

خدیجہ مستور کا تعلق ایسے گھرانے سے رہا جو تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ علم و ادب سے شغف رکھتی تھیں۔ ان کی وجۂ شہرت ان کا مشہورِ زمانہ ناول آنگن ہے۔ اس میں ایک جگہ خدیجہ مستور کا کہنا ہے عورت کسی نہ کسی مرد سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔

خدیجہ کے افسانوں کا موضوع ابتدا میں مرد کی بے وفائی اور ظلم کے گرد گھومتا ہے۔ ان کے ہاں کرداروں اور مکالمات کا توازن پایا جاتا ہے۔ خدیجہ نے اپنی تحریروں میں مصورِ غم کا روپ دھارنے کی بجائے حقیقی معنوں میں معاشرے میں موجود عورت کی ترجمانی کی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> خدیجہ مستور کا کمال یہ ہے کہ عورتوں کی تصویر کشی میں انھوں نے نگاہ کی گہرائی، مشاہدے کی باریکی اور تیز فقروں کی کاٹ سے معنویت کی دو جہات پیدا کر دی ہیں۔ ایک جہت پر توجہ انفرادی لحاظ سے عورت کے دکھ اور المیہ کی کہانیاں ہیں مگر اس کے ساتھ دوسری جہت پر یہ عورتیں اپنی انفرادی حیثیت سے بلند ہو کر معاشرے کے ان اجتماعی رویوں کے لیے استعارات کی صورت میں بھی اختیار کر لیتی ہیں جو عورت کے لیے قفس کی تیلیوں کی سی جنسیت رکھتے ہیں۔ [۱۳]

اس حوالے سے ان کے افسانہ بنـہ کی مثال لی جاسکتی ہے جس میں عورت اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کرنا چاہتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

ہاجرہ مسرور نے انسانی فکر و عمل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں کی عورت مظلومیت کی چادر اوڑھے ہوئے نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں ملمـع اور دلـدل میں عورت کی غربت اور مظلومیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر انور احمد کے بقول:

> ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں عورت کی مظلومیت کا اس طور ذکر ہوتا ہے کہ بے اختیار افسانہ نگار کی صنف کا احساس نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مردانہ سماج میں عورت کے بارے میں ابھی تک بہت سی زنجیریں زنگ آلود نہیں ہوئیں لیکن آج جس طرح سماج اور جذباتی تعلقات پیچ در

پیچ اور تہہ در تہہ ادراک پر منکشف ہو جاتے ہیں ان کے پیشِ نظر عورت کی مظلومیت کا ہی تھیسس پیش کیے جانا تعصب سے خالی دکھائی نہیں دیتا۔[۱۴]

احمد ندیم قاسمی کا شمار بھی ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے عورت خاص طور پر دیہاتی عورت کی زندگی اور اسے در پیش مشکلات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ احمد ندیم قاسمی نے اعلیٰ معیار کے ادبی افسانے تحریر کیے۔ قاسمی نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کی حقیقی زندگی، مسائل، نفسیاتی الجھنوں، دلی کیفیات، احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

قاسمی کا افسانہ رئیس بے ضمیری اور غربت جیسے موضوع کی بہترین مثال ہے۔

اگر جدید لکھاریوں کی بات کی جائے تو اس میں نمایاں نام بانو قدسیہ، انتظار حسین، خالدہ حسین، منشا یاد، مظہر الاسلام، رشید امجد اور ممتاز مفتی کا نام سر فہرست ہے۔ ان تمام ادیبوں نے عورت جیسے وسیع موضوع پر اہم افسانے لکھے۔

بانو قدسیہ کا نام ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورت کے مسائل خواہ جنسی نوعیت کے ہوں یا نفسیاتی حوالے سے کھل کر بات کی ہے۔ ان کی تحریریں ایسی خواتین کی نمائندگی کرتی ہیں جو معاشرے میں کسی نہ کسی حوالے سے مسائل کا شکار ہیں۔ ان کے ہاں نئی اور پرانی عورت کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے ناول راجہ گدھ جسے بانو قدسیہ کا شاہکار ناول کہا جاتا ہے، اس ناول میں اندرون لاہور اور ایلیٹ کلاس کے بہترین امتزاج سے نوجوانوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل کو خوب صورت پیرائے میں ڈھالا ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنی تحریروں سے بیسویں صدی کی افسانہ نگار خواتین میں منفرد مقام حاصل کیا جو کوئی اور نہ کر سکا۔ نئی نسل نے جنسی و نفسیاتی مسائل کو بے باکانہ انداز میں منفرد طرز سے پیش کیا۔ بانو قدسیہ نے جدید عورت کے جنسی مسائل پر جو بات کی اس کو عصمت جمیل نے کچھ اس طرح بیان کیا:

بانو قدسیہ کی عورت اپنی جنس کی طاقت سے آگاہ ہے اور اس طاقت کا استعمال کرنا بھی جانتی ہے اور اس کے لیے عورت کا حسین ہونا ضروری نہیں۔ خود آگاہ ہونا ضروری ہے۔ محبت انسان کے اندر کیسے

گھات لگاتی ہے، وہ شخصیت کو کیسے بدل کر رکھ سکتی ہے، یہ سارے داؤ پیچ ایک محبت سو کہانیاں کے رنگ میں بانو قدسیہ نے پیش کیے۔[۱۵]

بے جا آزادی سے گھرانوں میں جو مسائل و مشکلات پیش آتی ہیں جس کی وجہ سے مائیں بچیوں کے لیے پریشان رہتی ہیں۔ اس طرح کے موضوعات بانو قدسیہ کے ہاں نظر آتے ہیں۔ اسی دور کی ایک لکھنے والی جیلانی بانو بھی ہیں۔ نئی اور پرانی قدروں کی کش مکش جیلانی بانو کے افسانوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ ان کے افسانوں میں متوسط مسلم سماج میں رہنے والے افراد کی نفسیاتی کش مکش، جس میں ان کے اذہان پر پرانی روایات اور اقدار حاوی ہیں ان کا بیان صراحت سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم سماج پر تقسیمِ ہند کے اثرات اور مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل شامل ہیں۔

جیلانی بانو نے عورت کے بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

عورت کو ایک مخصوص سماجی نظام نے کس طرح مجبور و معزور کر رکھا ہے اس پر انسان نے کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں کس طرح مشقِ ستم کی ہے۔ لیکن اب نئے دور کی عورت نے ان تمام حالات سے گزر کر کس طرح اپنے آپ کو نئی زندگی سے ہم کنار کیا ہے اور خود ایک نشان راہ اور راہبر بن جانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی ہے۔ اس کی جھلکیاں جیلانی بانو کی کہانیوں میں نظر آتی ہیں۔[۱۶]

جیلانی بانو نے معاشرے میں موجود ایسی عورتیں جو اپنوں کے ہاتھ جنسی استحصال کا نشانہ بنتی ہیں ان کے احساسات اور مظلومیت کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ ایسی وفا شعار اور محبت کرنے والی بیویاں جو شوہر کے ہاتھوں فروخت کی جاتی ہیں ان کی تکلیف کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ جیلانی بانو نے اپنے افسانوں میں جدید و قدیم روایات، پرانی قدروں کے خاتمے کے اثرات کو فروغ دیا۔

مجموعی طور پر اگر جیلانی بانو کی تحریروں پر بات کی جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عورت کے ہر نئے اور پرانے روپ کو پیش کیا ہے۔ وہ عورت چاہے نچلے طبقے کی ہو یا اعلیٰ مقام و مرتبے کی حامل سب خواتین کی ذہنی کیفیات کو پیش کیا ہے۔ خاص طور پر ایسا غریب طبقہ جس کو کوئی اور مخلوق تصور کر کے ظلم کا شکار کیا جاتا ہو۔ جیلانی بانو

کے ہاں قدیم عورت کے مسائل اور جدید عورت کی مشکلات الغرض عورت کی حقیقی ترجمانی ان کی تحریروں کا خاصا ہے۔

خواتین لکھاریوں میں ایک اہم اور منفرد مقام قرۃ العین حیدر کا بھی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں سیاسی تبدیلیوں کے بعد پیدا شدہ صورت حال اور تقسیم کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کو ان کی تحریروں میں پیش کیا گیا ہے۔ قرۃ العین نے ملک کی تقسیم کے بعد کے حالات سے ابھرنے والے معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل سے متاثر کر ناول اور افسانے لکھے۔

قرۃ العین حیدر کا مکانی کینوس اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس ضمن میں ان کا افسانہ حاجی گل بابا بیکتاشی کے ملفوظات نہایت دلچسپ اور علامتی نوعیت کا حامل ہے۔ یہ افسانہ یوگوسلاویہ دور کی اردو یادگار ہے۔ صوفی ازم کا وہ دور مسلمانوں کا قابل فخر قیمتی سرمایہ تھا۔

قرۃ العین نے خواتین کے خصوصی مسائل پر بھی اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ ان کے ناولٹ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو میں خواتین کو درپیش مسائل کا تجزیہ فنکاری سے کیا ہے۔ بقول علی احمد فاطمی:

> اگر عورت کے اتنے تہذیبی رنگ و روپ نہ ہوتے تو شاید قرۃ العین حیدر، ہندوستان کی اس عورت کو تاریخ و تہذیب کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر لا کھڑا کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتیں۔ چمپا سے لے کر چاندنی بیگم کے حوالے سے ہندوستان کی سنسکرتی کو نہ کھنگال پاتیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی فکر، فلسفہ اور زورِ قلم سے عورت کے کردار کو ایک وقار عطا کیا اور اسے زندہ جاوید کیا۔ ذات پات اور زمان و مکاں کی ساری حدیں توڑ دیں۔[۱۷]

ممتاز شیریں کا شمار ایک منفرد طرز کی حامل خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں گھریلو زندگی اور میاں بیوی کے مابین رشتے کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے دونوں کے تعلق کو ذہنی آسودگی قرار دیا۔

ممتاز شیریں نے اپنے افسانے انگڑائی میں جنس پرستی جیسے موضوع کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا۔ اس افسانے سے متعلق مظفر علی لکھتے ہیں:

جب یہ افسانہ چھپا تو یوں لگا کہ ترقی پسند ادیبوں کی جنسی تسکین کی فضا میں کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا آ گیا ہے۔[۱۸]

عورت کے موضوع پر خواتین افسانہ نگاروں کے ساتھ بہت سے مرد افسانہ نگاروں نے بھی عورتوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل پر افسانے تحریر کیے ان میں ایک نام انور سجاد کا بھی ہے۔ انھوں نے ایسی عورت کی بات کی جو مردانہ سماج میں ہر طرح سے استحصال کا شکار ہے۔ ان کا موضوع جنسی اور فکری استحصال رہا ہے۔ ان کے خیال میں مرد چاہے شوہر ہو یا عام مرد اس کی نظر میں عورت کا کام بچے پیدا کرنا، ان کی پرورش اور مرد کے آرام کا خیال رکھنے تک محدود ہے۔ انور سجاد کا افسانہ جنم روپ اس کی بہترین مثال ہے۔

اب اگر ہم بیسویں صدی کے مختلف رجحانات اور میلان کا جائزہ لیں تو بیسویں صدی کے آغاز میں جہاں اور بہت سے موضوعات تھے وہیں مغرب میں مختلف تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان تحریکوں نے اردو ادب پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ ترقی پسندی، رومانوی تحریک، فطرت نگاری جیسے موضوعات پر لکھنے والے لوگوں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پریم چند جیسے اہم نام ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ان نام ور تین ناموں کے علاوہ نسیم حجازی، شیر محمد اختر اور اوپندر ناتھ اشک کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو تحریکوں سے متاثر ہو کر لکھتے رہے۔ ان تمام لکھاریوں نے نفسیات کے جدید علم سے بھی استفادہ کیا۔ ان داخلی رجحانات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو افسانے میں فرد کے داخلی میلانات کو اظہار کی راہ ملی۔ نفسیات کے جدید علم سے فائدہ حاصل کیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد نمایاں ہونے والے بیشتر ادیبوں نے انسانی نفسیات کو افسانے کا موضوع بنا کر باطنی کیفیات کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ فنی سطح پر نفسیات کے علم سے حاصل ہونے والی تکنیکوں کا استعمال بھی پہلے ان ادیبوں نے کیا۔

اسی دور میں ابھرنے والے ادیبوں میں ممتاز مفتی کا نام انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ نفسیات ان کے ہاں تجربی حیثیت رکھتی ہے۔ عورت ممتاز مفتی کے افسانوں کا محبوب ترین کردار ہے۔

ممتاز مفتی کے ابتدائی سفر کے حوالے سے نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> ممتاز مفتی کو بیسویں صدی کا نمائندہ ادیب کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی تصانیف اور ان کے وسیع دائرۂ اثر کے حوالے سے بیسویں صدی میں اردو نثر کی نمایاں ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ممتاز مفتی کی اس فنی عظمت کے پس پشت ان کا مخصوص ذہنی و فکری رویہ کار فرما نظر آتا ہے جو شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ انھوں نے زندگی کو خود اپنی نظر سے دیکھا اور جیسی بھی وہ انھیں نظر آئی، اسے ویسا ہی پیش کر دیا۔[19]

عورت کا کردار ممتاز مفتی کی فکری اڑان کے ساتھ ہر دور میں ارتقا پذیر رہا ہے۔ ممتاز مفتی کے ابتدائی دور کے زیادہ افسانوں میں عورت کا ایسا ہی تصور دیکھنے کو ملتا ہے جو باوفا، بے لوث محبت کرنے والی اور مشرقی عورت کا کردار ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں جو عورت ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے وہ ایسی عورت ہے جسے ہم سب اپنے گرد و پیش میں اکثر دیکھتے رہتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی نفسیاتی الجھنیں نظر آتی ہیں جن نفسیاتی الجھنوں پر کہانی کا شبہ بھی ہوتا ہے۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ عورت کے لاشعور میں پوشیدہ محرکات کو جس طرح اجاگر کیا یہ ان ہی کا خاصا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نسوانی کرداروں میں بھی کیفیات کا بیان الجھاؤ کا شکار ہوتا گیا۔ تحلیل نفسی اور جنسی مسائل کا بیان ممتاز مفتی کا خاص موضوع ہیں۔ ممتاز مفتی نے انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کر کے اس نکتے کو بخوبی سمجھا ہے کہ انسان ایک ایسی کائنات ہے جس میں کش مکش کا گہرا سمندر موجود ہے۔ اس سمندر میں شعور اور لاشعور کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ یوں نہ صرف انسان کی ذات پر نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ لاشعوری طور پر یہ اثرات انسانی شخصیت میں پیچیدگیوں کو جنم دیتے ہیں۔ عورت کی نفسیاتی الجھنوں کی پیش کش میں انھوں نے نفسیات کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے اُن کی باریکیوں کو فنکاری کے ساتھ اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ بقول سید وقار عظیم:

ممتاز مفتی نے جنسی نفسیاتی تجزیہ کو اپنا موضوع بنایا تھا اور اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ اس قدر سنبھل کر اور سوچ سمجھ کر لکھا کہ جو چیز ممتاز مفتی سے پہلے بدنام تھی اس نے ایک وقیع علمی موضوع کی حیثیت اختیار کر لی۔ [20]

ممتاز مفتی نے اردو افسانے کو نفسیاتی رجحان سے آشنا کرایا۔ ایسا نہیں کہ پہلے اس موضوع پر لکھا نہیں گیا بلکہ مفتی کے ہم عصروں کے ہاں بھی یہ رجحان ملتا ہے لیکن ممتاز مفتی کے یہاں ہمیں کرداروں کی نفسیات بنی کا رجحان نہایت توانائی، فنی تکمیل اور جامعیت کے ساتھ پہلے پہل نظر آتا ہے۔ نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

ممتاز مفتی کی تخلیقی زندگی کا پہلا دور جنس، نفسیات اور مشاہدۂ باطن کے حوالے سے سماجی نظام کے تنقیدی جائزے پر مبنی ہے۔ ان کے معاصرین میں سے منٹو، عصمت چغتائی اور بیدی کے ہاں بھی یہی موضوعات کلیدی نوعیت رکھتے ہیں۔ [21]

ممتاز مفتی کے ہاں جو عورت کے کردار ہمیں نظر آتے ہیں ان کی ایک قسم افسانے آپا، باجی، سمیع اور اسمارہ اور جھکی جھکی آنکھیں میں دیکھنے کو ملتی ہیں جو زندگی کی آگ کو دل کی تہہ میں دبائے ہوئے خاموش سلگتے رہتے ہیں اور مدھم لو میں جینے پر مجبور ہیں۔ دوسری طرح کے کرداروں میں ہر جائی، بے وفا اور اپنی دھونس جمانے والی عورت نظر آتی ہے جو مفتی کی آئیڈیل عورت ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں نسائی دوئی نظر آتی ہے۔ اس میں ان کے ذاتی تجربات، مشاہدات کی جھلک ملتی ہے۔

ممتاز مفتی کا ایک اہم موضوع جنس اور انسانی نفسیاتی الجھنیں ہیں۔ ان کے ہاں جنس کا بیان بڑے واضح انداز میں ملتا ہے۔ مفتی زندگی میں جنس کی اہمیت کے قائل ہیں۔ وہ انسانی زندگی کا دار و مدار بھی اسی پر منحصر سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر فضل امام لکھتے ہیں:

ممتاز مفتی کا رویہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں جنسیات اور نفسیات کو ہی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور مرد کے لاشعور کی گہرائیوں میں جا کر اس کی نفسیاتی کیفیات اور پس منظر میں اس کے جذباتی عمل کی شناخت

کراتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ فرائڈ کی تحلیل نفسی پر ان کا افسانوی رویہ مرکوز رہتا ہے۔ جنسی جذبات کو بروئے کار لانے میں وہ فرد کے تحت الشعور اور لاشعور پر خاص طور پر متوجہ رہتے ہیں۔ [۲۲]

زندگی کے مختلف معاملات، معاشی و معاشرتی، تہذیب و تمدن اور ذہنی افکار کی پرکھ ادب ہی کے مرہون منت کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں مختلف سماجی معاملات، عقائد اور نفسی پہلوؤں اور انسانی رویوں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ چونکہ مصنف کے خیالات و تصورات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ وہ مختلف الفاظ کو پرو کر ناول، افسانے اور کہانیاں بنتے ہیں۔ جہاں لکھاری ہر طرح کے موضوع کو اپنی تحریر میں جگہ دیتا ہے۔ وہیں یہ بات واضح ہے کہ عورت ہر لکھنے والے کا پسندیدہ موضوع رہی ہے۔ لکھنے والوں نے عورت سے متعلق اپنے احساسات، خیالات، جذبات اور تجربات کو مختلف حوالوں سے پیش کیا۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ معاشرہ تنہا مرد سے نہیں چلتا عورت اور مرد دونوں معاشرے کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں معاشرے کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ عورت کا وجود زندگی کی بہار ہے۔ عورت ہی سے انسان کی نسل کی بقا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کا وجود اگر اس جہاں میں نہ ہو تو یہ دنیا معمورۂ بن جائے۔ داستانوں سے لے کر آج تک کی مختصر کہانی میں عورت کو مختلف موضوعات کے لحاظ سے ہر ایک نے اپنے الگ انداز سے بیان کیا ہے۔

برصغیر میں جس دور میں اردو افسانے کی ابتدا ہوئی یہی وہ زمانہ تھا جب حقوقِ نسواں کے لیے دنیا بھر میں آواز بلند کی جا رہی تھی۔ اس تحریک نے مغرب کے ساتھ ساتھ مشرقی لکھاریوں کو بھی متاثر کیا۔ یوں عورت کو بطور موضوع مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ ابتدائی مصنفین میں علامہ راشد الخیری کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے ہندوستانی عورت کے مسائل کو نہایت خوب صورتی سے اپنے افسانوں کے ذریعے بتایا۔ اس کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، پریم چند بھی اس دور میں مختلف موضوعات پر لکھ رہے تھے۔ ان کے ہاں بھی عورت کو بطورِ کردار ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ یلدرم کے ہاں عورت کو رنگین اور لطافت سے بھرپور دکھایا گیا۔ انھوں نے عورت کے مسائل اور اس کی آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ جبکہ پریم چند حقیقت پسند افسانہ نگار تھے تو ان کا مقصد ہندوستانی معاشرے کی عورت کے ساتھ برتا جانے والا رویہ، استحصال، اس کو درپیش مسائل کو اجاگر کرنا تھا۔ پریم چند نے حقیقی زندگی سے کہانیاں اخذ کر

کے اپنے افسانوں کو جلا بخشی۔ اس کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور منٹو جیسے بڑے نامور ادیبوں نے کھل کر عورت کے مسائل اور مشکلات پر افسانے اور ناول لکھے۔

اردو افسانے میں عورت بطورِ موضوع بہت سے لکھاریوں کے ہاں ملتی ہے۔ مگر عورت پر سب سے زیادہ اور واضح انداز میں خواتین لکھاریوں نے ہی بات کی ہے۔ ان سب سے پہلے رشید جہاں کا نام اہم ہے۔ رشید جہاں نے عورت کے حقوق کے لیے کھل کر آواز اٹھائی۔ اس کے علاوہ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور اور خالدہ حسین کے نام نمایاں ہیں۔ جدید لکھنے والوں میں انتظار حسین، منشا یاد، مظہر الاسلام، رشید امجد اور منٹو کے بعد کے زمانے میں افسانے لکھے۔ ممتاز مفتی نے عورت کے جنسی مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا۔ اس سے پہلے عورت کی حیثیت اور نفسی پہلوؤں کی اس طرح سے عکاسی کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ ان کے افسانوں کی عورت کے کردار معاشرے میں موجود عام سمجھے جانے والے کردار ہیں۔ مفتی صاحب نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں اتنا اہم موضوع خوب صورتی سے سمیٹا۔ تحلیل نفسی، جنسی مسائل اور نفسیات ممتاز مفتی کے موضوعات کا خاصا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد نمایاں ہونے والے بیشتر ادیبوں نے انسانی نفسیات کو افسانے کا موضوع بنا کر باطن کی کھوج کی۔ فنی سطح پر نفسیات کے علم سے حاصل ہونے والی تکنیکوں کا استعمال بھی پہلے ان ہی ادیبوں نے کیا۔ تمام لکھاریوں نے نفسیات کے جدید علم سے استفادہ کرتے ہوا اردو افسانوں میں فرد کے داخلی میلانات کے لیے نئی راہ ہموار کی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اجمل، اردو نظم میں تصورِ عورت (لاہور: پی ایچ ڈی اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۔

۲۔ بانو قدسیہ، حوا کے نام (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۰۔

۳۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، پردہ (، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۷۔

۴۔ غلام اکبر ملک، عورت کا مقدمہ: اسلام کی عدالت میں (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹ء)، ص ۲۰۔

۵۔ اسلم درانی، مقدماتِ باغ و بہار (مرتبہ)، (ملتان: کاروان ادب، ۱۹۹۵ء)، ص ۳۲۹۔۳۳۰۔

۶۔ ریحان حسن، ڈاکٹر، ممتاز مفتی: حیات و ادبی خدمات (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۲۰۱۱)، ص ۴۸۔

۷۔ حمیرا اشفاق (مرتبہ)، نثر رشید جہاں (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲)، ص ۱۱۔۱۰۔

۸۔ آنسہ احمد سعید، کرشن چندر کے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان)، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۴۔

۹۔ انور احمد، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ (اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۸۳۔۳۸۲۔

۱۱۔ آنسہ احمد سعید، کرشن چندر کے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۴۔

۱۲۔ سلیم اختر، افسانہ اور افسانہ نگار، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۱۴۔

۱۳۔ راشدہ قاضی، اردو افسانوی ادب میں خدیجہ مستور کا مقام، (اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۴۸۔

۱۴۔ انوار احمد، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، ص ۱۶۷۔

۱۵۔ عصمت جمیل، نسائی شعور کی تاریخ: اردو افسانہ، (اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۳۱۔۲۳۰۔

۱۶۔ عصمت جمیل،اردو افسانے میں تصورِ عورت(پی ایچ ڈی اردو، بہاؤالدین زکریایونی ورسٹی ملتان،۱۹۹۸ء)،ص۱۵۴۔

۱۷۔ گوپی چند نارنگ،اردو افسانہ روایت اور مسائل،ص۱۱۱۔

۱۸۔ عصمت جمیل،اردو افسانے میں تصور عورت،ص۱۸۷۔

۱۹۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا(پی۔ایچ۔ڈی اردو)(اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)،ص۶۔

۲۰۔ وقار عظیم،نیا افسانہ،ص۲۴۴۔

۲۱۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۹۔

۲۲۔ فضل امام،نیا دور، مفتی کا افسانہ ''آپا'' ایک تجزیاتی مطالعہ(جولائی ۲۰۰۵ء)، ص۱۰۔

باب دوم:

ممتاز مفتی کے افسانوں میں موجود مختلف نفسیاتی نظریات

باب دوم:

ممتاز مفتی کے افسانوں میں موجود نفسیاتی نظریات کا مختصر جائزہ

انسان کی ترقی کا سفر بہت سے تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ فلسفہ عقل و حکمت، سوچ و نظریات کی ایسی سرزمین ہے جس سے علم و فنون کے نئے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس تمام تر فکر کا مرکز انسان اور انسانی نفسیات ہے۔ ہمارا معاشرہ جس میں ہم رہتے ہیں، ہماری زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ انسان جس جگہ آنکھ کھولتا ہے وہاں کے تہذیب و تمدن، ثقافت، رہن سہن، معاشرتی و معاشی نشیب و فراز الغرض تمام چیزیں اس کی سوچ و خیالات کو براہِ راست متاثر کرتی ہیں۔

جیسے فرد کے لیے معاشرے کی روایات، تہذیب و ثقافت معاشی و معاشرتی اقدار اہم ہیں، اسی طرح دنیا کا کوئی بھی ادب خواہ اس کا موضوع کوئی بھی ہو اسے انسانی عادات واطوار ہو، نفسیات، اس کے داخلی و خارجی نظریات، فلسفۂ حیات، تہذیب و تمدن اور انسانی فکر براہِ راست متاثر کرتی ہے۔ کسی بھی قوم اور معاشرے کا ادب اس کی سماجی اور معاشرتی روایات کا عکاس ہوتا ہے۔

انسانی نفسیات کو سمجھنے اور لکھنے کے لیے فلسفۂ حیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ نفسیات کے موضوع پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ مغربی مفکرین اور خاص طور پر نفسیات دان جنھوں نے ہمارے اردو ادب کو متاثر کیا ہے۔ مختلف ادوار میں لکھاری مغرب میں چلنے والی تحریکوں سے متاثر ہو کر لکھتے رہے۔ مارکسزم، تانیثیت یا فیمینزم، رومانویت وغیرہ ایسی بہت سی تحریکوں کی مثال موجود ہے۔ ان میں بہت سے مصنفین ایسے بھی تھے جنہیں نفسیات جیسے موضوعات نے متاثر کیا۔ یوں ان کی تحریروں میں نفسیاتی نظریات واضح ہوتے گئے۔ نفسیات کی رو سے انسانی ذہن کے تین مختلف افعال ہیں۔

شعور:

شعور کیا ہے؟ جب ہم اپنے خیالات سے ایک خاص وقت میں باخبر ہوتے ہیں تو یہ شعور کے زمرے میں آتا

ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ شعور وہ ہے جو زمانہ حال میں ہمارے ذہن اور یادداشت کا حصہ ہے۔ ہم اس کو سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں جو حالات و واقعات پیش ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق ہمارے ذہن کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کیفیت شعوری ہوتی ہے۔ کاوش اور کوشش کے لیے چیزوں کی موجودگی کا نام احساسِ شعور ہے۔

تحت الشعور:

یہ شعور کا ایک ایسا کنارہ ہے جہاں سے کوشش کرنے سے خیالات موقع و محل کے مطابق شعور میں آن وارد ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ہم کچھ چیزوں کو عارضی طور پر بھول جاتے ہیں اور کچھ دیر یادداشت ٹٹولنے اور پر سکون ہو کر سوچنے کے بعد وہ چیز یا نام ہماری یادداشت میں در آتا ہے۔ یہ یاد اس وقت تحت الشعور میں تھی جو بعد میں شعور میں داخل ہوئی۔

لاشعور:

نفسیات کے میدان میں لاشعور کو بطورِ اصطلاح استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ نفسیات نظریات میں بنیادی اہمیت کا حامل نکتہ ہے اور تمام نظریات اس کے گرد محو گردش ہیں۔ بلاشبہ فرائیڈ اس اصطلاح کا بانی ہے۔ اسی نے اس کو تلاش کیا اور وضع کیا۔ خود فرائیڈ کو بھی اس بات کا ادراک تھا۔ فرائیڈ سے پہلے گزرنے والے ماہرین نیٹشے، افلاطون، لائینز، سوپن ہار وغیرہ نے لاشعور کا تذکرہ کیا لیکن فرائیڈ نے لاشعور کی اصطلاح کو سائنسی طریقہ کار اپناتے ہوئے وضع کیا اور اپنی فکر کی اساس بنایا۔ جہاں کہیں بھی لاشعور کا لفظ ملتا ساتھ ہی فرائیڈ کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ فرائیڈ نے لاشعور کی جو وسیع معانی اور مفہوم پیش کیے وہ کسی اور کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتے۔

فرائیڈ کے نزدیک لاشعور میں ایسے خیالات ہوتے ہیں جو آسانی سے شعور مین نہیں آ سکتے اور نہ ہی شعوری طور پر لایا جا سکتا ہے بلکہ ان کو شعور میں لانے کے لیے ایک خاص طریقہ کار کی ضرورت ہوتی ہے جسے اس نے "تحلیلِ نفسی" کا نام دیا۔ ل ذہن میں ایک باقاعدہ ربط ہے جس کے ذریعے وخیالات ایک حصے سے دوسرے حصے میں منتقل

ہوتے ہیں۔ فرائیڈ کے نظریات کی مطابق ذہن کا مطالعہ ایک زاویۂ نگاہ سے بھی کیا جاسکتا ہے۔

نفسیاتی رجحان کے زیرِ اثر لکھے جانے والے افسانوں کے موضوعات میں نفس لاشعور، جنسی رویئے کی تشکیل، نفسیاتی الجھنیں، اخلاقی نظریات، انسانی احساسات وجذبات، مسائل ومشکلات وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> بیسویں صدی نئے افکار و نظریات کے حوالے سے بہت بار آور اور بت شکن ثابت ہوئی۔ زمانوں سے قائم تصورات واعتقادات کے محل دھڑام سے گر گئے۔ زندگی کا ایک نیا اسلوب وضع ہونے لگا۔ اس صدی میں جہاں مادی طاقتوں نے اپنے وجود کو منوایا اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہوشربا ترقی کی وہاں ذہن کے گھمبیر اور پُراسرار گردانے جانے والے تاریک براعظم بھی دریافت کر لیے گئے۔ انسانی ذہن کا سائنسی بنیادوں پر مطالعہ ہونے لگا اور اس مطالعہ کے لیے نت نئے مفروضات قائم کیے جانے لگے۔ اس صدی میں فرائیڈ اور ہیولاک ایلس جیسے دانشوروں کی بدولت جنس کو پہلی بار سنجیدہ مطالعہ کا موضوع بنانے کا آغاز ہوا۔[1]

انسانی نفسیات کو موضوع بنانے والے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ممتاز مفتی کا ہے۔ مفتی صاحب چونکہ فلسفہ کے طالب علم رہ چکے تھے اس لیے انھوں نے فرائڈ، یونگ دوستوفسکی جیسے فلاسفروں کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ ان کے زمانے میں تحلیل نفسی جیسے موضوع پر سب سے پہلے نظر فرائڈ نے کی اس نے جنسیات کی عینک لگا کر انسانی نفسیات کا پوسٹ مارٹم کیا۔ وہ اپنے نظریات و تجربات کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں جنسی اعمال و وظائف، محرومیاں و کامیابیاں انسان کے نفسیاتی رُخ کا تعین کرتی رہی ہیں۔

اس کے برعکس یونگ کے نظریے کے مطابق ادب تکمیلی عمل ہے اور اس میں فنکار تمام نوع انسانی کی ان شدید خواہشوں کو ظاہر کرتا ہے جن کا تعلق اس کے دور کی مخصوص خامیوں کو دُور کرنے اور ایک نئی سطح پر ان کا توازن قائم کرنے سے ہے۔

اسی طرح ممتاز مفتی نے تحلیل نفسی، لاشعور معاشرتی و معاشی رکاوٹوں، اخلاقی نظریات جیسے موضوعات کو

اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ مفتی صاحب کے افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانی نفسیات سے براہِ راست متاثر ہیں۔اس کی ایک وجہ ان کے ذاتی زندگی کے حالات وواقعات ہیں۔

ایک فن کار اپنی تخلیقی زندگی میں بہت سی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے۔زندگی کے تجربات ومشاہدات، معاشی و معاشرتی روایات، انسانی رویے اور انسانی نظریات وغیرہ انسانی تصور کے ارتقائی سفر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ابتدا میں مفتی صاحب نے فلسفہ کو پڑھا تو نفسیات جیسے موضوع میں دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔اس ضمن میں زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے برگساں، نطشے، برٹرینڈرسل، فرائیڈ، جیمز، والٹس، ہیولاک ایلس اور دوستوفسکی کا مطالعہ کیا۔نفسیات میں بالخصوص جنسی نفسیات کا پہلوان کے ہاں نمایاں ہے۔

بیسویں صدی میں جہاں سیاسی، معاشرتی، معاشی طور پر بہت زیادہ تغیر و تبدل ہوا وہیں لکھنے والے بھی بہت متاثر ہوئے۔ایک طرف اگر نئے نظریات، خیالات و افکار اور تصورات قائم ہوئے تو وہیں دوسری طرف فرد کی نفسیات بھی متاثر ہوئی۔انسانی نفسیات کی پرکھ کا آغاز سائنسی تجربات اور مفروضات پر ہونے لگا۔ایسے ہی وقت میں بڑے بڑے نفسیات دان جو براہِ راست جنسی نفسیات پر تجربہ اور مشاہدہ کر رہے تھے ان کے تصورات کو اردو ادب کے لکھنے والوں نے اپنے موضوعات کا حصہ بنانا شروع کر دیا۔ان ماہرِ نفسیات میں فرائیڈ اور ہیولاک ایلس زیادہ نمایاں ہیں۔ انھیں سے متاثر ہو کر ممتاز مفتی نے بھی جنسی نفسیات کے موضوع پر قلم سرائی کی۔لیکن مفتی صاحب علاقائی اور مقامی نفسیات پر زیادہ بات کرتے ہیں۔وہ مغربی جنس کے نفسیاتی نظریات سے متاثر ضرور ہوئے مگر ان کے ہاں یہ موضوع مقامیت تک محدود رہا۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں تصورِ عورت کے ارتقا، سماجی و معاشی رویّے، جنسی نفسیات اور لاشعور کی ہیجانی اور شہوانی تحریکات جیسے اہم نکات پر بات کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مغربی مفکرین کے نفسیات کے موضوعات، حالات و واقعات، اور نفسیاتی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ان میں زیادہ اہم فرائیڈ، یونگ، ایلس اور ایڈلر کے فکری و نفسیاتی نظریات ہیں۔

- جنسی رویوں کی تشکیل

- نفس لاشعور
- معاشرتی وسماجی رکاوٹیں
- شعور اور لاشعور کی عکاسی
- جنسی جبلتیں
- مذہبی، سیاسی، معاشی و معاشرتی جبر
- انسانی رویے (حسد، کینہ، رقابت، خوف دہشت، ندامت پشیمانی وملامت) وغیرہ

نفسِ لاشعور و شعور کا تعلق:

لاشعور سے مراد انسان کے باطن میں چھپے ایسے احساسات و خیالات ہیں جو ابتدا سے ہی موجود ہوتے ہیں مگر شعور و عقل میں فرد ان سے اجتناب کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کے پیچھے جبلتیں حائل ہوتی ہوں۔ نفرت کے جذبات کا اظہار ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعتاً کسی کو اذیت پہنچا رہا ہے بلکہ بعض اوقات متضاد خیالات سے اندر ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔

فرائیڈ کے نظریۂ لاشعور اور تحلیل نفسی کو بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ پہلا شخص نہیں جس نے لاشعور پر بات کی ہو۔ اس سے پہلے افلاطون، ارسطو، لائینیز، شوپنہار اور نٹشے وغیرہ نے اس موضوع پر بات کی ہوئی تھی۔ فرائیڈ کے اختلاف کی وجہ جنسِ لاشعور کا موضوع ہے۔ اس نے جنس سے متعلق ایک حد سے اجتناب برتا اور کھل کر جنس کے تصور پر بحث کی۔ فرائیڈ کا مقصد نفسِ لاشعور میں دبی خواہشات اور اس کے پس منظر کو سامنے لانا تھا۔ فرائیڈ نے نفسِ لاشعور میں جنس کو قانون ارتقا، علم و ادب اور فنون کے لیے اہم زینہ قرار دیا۔ اس کے مطابق جنسی تحریک انسانی رویوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

> نظریہ لاشعور کے اس ضمن میں امر واضح رہے کہ فرائیڈ سے قبل اور اس کے بعد بھی ماہرینِ نفسیات لاشعور کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں لیکن ان سب کا اپنا اپنا مخصوص مفہوم تھا۔ جہاں تک فرائیڈ کا تعلق ہے تو لاشعور اس کے طریقۂ علاج یعنی تحلیلِ نفس سے وابستہ ہے۔[۲]

بعض اوقات لاشعور میں بڑھنے والے احساسات و جذبات کو انسان شعوری طور پر قبول نہیں کرتا۔ لاشعور کے معانی اسے شعور میں اذیت دیتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی و منشا کے بغیر شعور میں فیصلے کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں شعوری سطح اور لاشعوری سطح پر جو معنی و مفہوم ظاہر ہوتے ہیں دونوں میں تضاد ہوتا ہے۔ یہی تضاد نفسیاتی دباؤ کی بنیاد بنتا ہے۔ شاہدہ ارشد لکھتی ہیں:

> فرائیڈ نے انسانی سوچ کا انداز تبدیل کر دیا۔ اس کی تعلیمات نے اخلاق، قانون مذہب اور ادب غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے اور انسانی فکر کے تمام گوشوں کو متاثر کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "ایڈی پس" الجھاؤ کے نظریے کا بانی ہے جس نے نفسیاتی الجھنوں کو سلجھانے میں اپنی تمام زندگی گزاری کیا وہ خود بھی ان نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھا یا خود ان نفسیاتی الجھنوں سے ماورا تھا۔[۳]

یونگ بھی فرائیڈ کا ہم خیال تھا مگر جنس کے حوالے سے اُس کو فرائیڈ سے معمولی اختلاف تھا۔ وہ لاشعور اور شعور کے وجود کا حامی ہے مگر وہ تمام تر نفسیاتی مسائل کو جنس کا مرہونِ منت نہیں گردانتا۔ اس کے مطابق سماجی، معاشی و معاشرتی اور مذہبی حوالے بھی انسان کے مسائل کی وجہ ہیں۔

نجیبہ عارف اپنے مقالے میں یونگ سے متعلق رقم طراز ہیں:

> ایک ہی شخص کا اپنے دوست، بیوی، محبوبہ، افسر ہو یا والدین سے طرزِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ وہ موقع محل کے لحاظ سے موزوں چہرہ اوڑھ لیتا ہے اور اپنی خواہشات کو لاشعور میں دھکیل دیتا ہے جو اس کے خیال میں غیر اخلاقی اور سماجی لحاظ سے ناقابل قبول ہوتی ہیں۔ یہی ناپسندیدہ عناصر جنہیں فرد لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں ایک الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے بعض اوقات انسان سے ایسی احمقانہ، غیر متوقع غلطیاں سرزد ہوتی ہیں جو اس کے ظاہری روپ کے مماثل نہیں ہوتیں۔[۴]

لاشعور میں خیالات آزاد اور ہم معنی ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں بات سے ایک کی بجائے کوئی دوسرا مفہوم بھی اخذ ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ زبانوں کا تضاد بھی ہے۔ ہر شعوری عمل کے پیچھے لاشعور کے اثرات ضرور موجود ہوتے ہیں چاہے نوعیت مثبت ہو یا منفی۔ اکثر اوقات لاشعور کا منفی تصور شعور میں مثبت بن کر ابھرتا ہے۔

فرائیڈ کا کہنا ہے کہ یہاں ہمیں شعور اور لاشعور کا فرق دکھائی دیتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ نہ تو ایک ہی نفسی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں اور نہ ہی توانائی خرچ کرنے کے دو مختلف راستے ہیں۔ بلکہ شعور میں شے اور اس کا ملحقہ لفظ ہوتا ہے لیکن لاشعور میں صرف شے ہوتی ہے۔ لاشعور پر الفاظ کا غلاف چڑھا نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یوں بھی دی جا سکتی ہے جیسے آپ اگر کسی دوسرے ملک جائیں جہاں کی زبان سے آپ ناواقف ہیں آپ کسی شے کو دیکھتے ہیں جس کا لاشعور کو پتہ ہے مگر زبان سے ناواقفیت آپ کو الفاظ کے شعوری اظہار میں دشواری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ قبل شعور میں شے کے ساتھ الفاظ بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا قبل شعور پر الفاظ کا پردہ پڑا ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کا پردہ ترقی یافتہ نفسی تجربے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

تحلیلِ نفسی:

تحلیلِ نفسی کا تعلق ایک طرح سے تعلیمی نفسیات سے بھی ہے۔ تعلیمی عمل جس کی بنیاد ایسے جبلی ڈھانچے پر پڑی جس نے فرد کی زندگی اور شخصی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ تعلیمی شعور کا کام ہی فرد کی سیرت و کردار کی نشوونما کرنا ہے۔

تحلیل نفسی نفسیات کے وسیع مطالعہ کا نام ہے جو شعور، نیم شعور و لاشعور، جنسی ہیجانات، اعصابی خلل، احساس برتری و کمتری کی پیچیدہ صورتِ حال پر مشتمل ہے۔ ادبی تخلیق میں شاعر و ادیب کی نفسیاتی زندگی کے عناصر کسی نہ کسی شکل میں ضرور شامل رہتے ہیں۔ زبان دانشوروں کے نفسیاتی اظہار کا ذریعہ ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق بنیادی جبلتیں اور میلانات ذہنِ انسانی کی اساس ہیں۔ یہ جبلتیں ادراک، تاثرات یا جذبات جن کا تعلق متحرکِ جسمانی اعضا سے ہے۔

فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی کے بعد اس بات کا انکشاف ہوا کہ ذہنی کیفیت اور قوتِ تخلیق کے باطن میں جبلتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنی خواہشات کو پورا نہیں کر پاتا تو وہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اس کو ظاہر کرتا ہے۔

TH23139

فرائڈ کے لحاظ سے جب انسان کے دل میں دبی ہوئی بہت سی پوشیدہ خواہشات کی تکمیل نہیں ہو سکتی تو وہ حقیقت سے دورِ خیالی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔ ایڈلر بھی اس نکتہ پر کہتا ہے کہ انسان احساس کمتری سے نجات اور برتری کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ تحلیل نفسی ایسا تجزیہ ہے جس میں دبے ہوئے خیالات و جذبات اور ان کا اقرار فرد کے ذہن میں موجود کش مکش کو رفع کر دیتا ہے۔

تحلیلِ نفسی کا پہلا کام یہ ہے کہ دبائے ہوئے تصورات کو لاشعور سے نکال کر شعور میں لائے تاکہ مریض کو عقلی طور پر سمجھ کر ان کا حل تلاش کیا جا سکے۔ تحلیل نفسی کے وظائف میں یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ خیالات و تصورات کی زنجیر شعور سے لاشعور تک کچھ اس طرح جوڑی جائے کہ شعور میں دیئے ہوئے پراگندہ الجھے ہوئے خیالات شعور میں چلے آئیں۔ اس طرح فرد ذہنی تناؤ کا شکار ہوتا ہے تناؤ کی وہ رسی کمزور پڑ جائے۔

تحلیل نفسی کے دوران ہمیشہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مریض کی انا کے مختلف غیر شعوری طریقوں کو دور کرتے ہوئے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا کی جائے کہ وہ جبلی خواہشات کو برا سمجھنے، ان سے ڈرنے، خوف کھانے اور انھیں دبانے کی بجائے ان کو درست اور فطری سمجھے اور ان خواہشات کی تسکین کے لیے وہ حقیقت میں ایسے ذرائع تلاش کرے جو اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے قابل قبول ہوں۔ اس طریقہ کار کو اپنانے سے زندگی کش مکش اور دکھ و غم کا مرقع بننے کی بجائے دل چسپ اور قابل قدر لگنے لگتی ہے۔

بچہ پیدائش کے بعد ذہنی نشوونما کے عمل سے گزرتا ہے۔ اگر کسی فرد کی زندگی کی ابتدا سخت مزاجی سے ہوئی ہے تو ضروری نہیں کہ آخری عمر تک وہ اسی مزاج کا حامل ہو۔ بہت سے سخت گفت و شنید کرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ نرم مزاج ہو جاتے ہیں۔ بچوں کی تربیت، اخلاقیات کے سبق اور شخصی تعمیر کے لیے ایک استاد کا ماہرِ نفسیات ہونا ضروری ہے۔ ایک معلم سب سے بہتر تحلیلِ نفسی کرتا ہے۔ اس عمل سے وہ بچے کی تربیت بہتر انداز سے کر سکتا ہے۔

فرد کی زندگی پر انفرادی اور گروہی دونوں طرح کی تحلیل نفسی اثرانداز ہوتی ہے۔ انفرادی طور پر آپ خود کو جتنا پابند سمجھتے ہیں گروہ کی شکل میں خود کو آزاد اور طاقت ور سمجھنے کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے فرد جو اکیلے میں خوف زدہ اور سہما ہوا لگتا ہے وہ گروہ میں شامل ہو کر زیادہ جھگڑالو اور خطرناک ہو جاتا ہے۔

گروہ میں فرد واحد کے احساسات وجذبات بھڑکے ہوئے ہوتے ہیں ان میں زیادہ شدت پائی جاتی ہے:

> گروہی زندگی میں جذبات بام عروج پر چڑھے ہوتے ہیں۔ گروہ کی عقلی زندگی میں انحطاط آجاتا ہے، اس کمی کو وفورِ جذبات سے پُر کیا جاتا ہے۔ جوش وخروش کا سمندر چڑھا ہوتا ہے اور جو چیز سامنے آتی ہے اسے بہالے جاتا ہے۔[۵]

فرائیڈ کو جدید نفسیات میں "تحلیل نفسی" کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنے مریضوں پر تجربات کر کے بہت سی اہم دریافتیں کیں نئے پہلو اُجاگر کیے۔

فرائیڈ نے فرد کی شخصیت بنانے میں کارفرما عوامل کو نفسیات میں متعارف کروایا، جن میں بنیادی کردار خاندان اور بالخصوص باپ کی طرف سے جارحانہ رویہ، لاشعور کا انسانی زندگی پر اثر، ماں باپ کے ذریعے منتقل ہونے والی اقدار وروایات کا شامل ہیں۔ اس حوالے سے فرائیڈ نے سب سے پہلے انسانی کردار کے لاشعوری محرکات کو دریافت کیا:

> "فرائیڈ نے بتایا کہ پیدائش پر بچے میں صرف لاشعوری جبلی خواہشات اور ضروریات موجود ہوتی ہیں جن کی بچہ فوری تسکین چاہتا ہے۔ ان لاشعوری جبلی خواہشات کو فرائیڈ نے لاذات یا اڈ کا نام دیا ہے۔ جب بچے کی یہ خواہشات فوراً پوری نہیں ہوتیں تو اس میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ بچے کی ذات کے باہر کوئی بیرونی دنیا ہے جو اس کی خواہشات کو کبھی فوراً اور کبھی دیر سے پورا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بچے کی انا (Ego) وجود میں آتی ہے۔ انا انسانی ذہن کا وہ حصہ ہے جس کے تحت ایک شخص معقول طور پر سوچتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اپنی خواہشات ضرور پوری کرنی چاہئیں لیکن یہ عمل عموماً فوراً نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کئی دفعہ اپنی خواہشات کو ملتوی کرنا پڑتا ہے۔ جب بچے کی عمر ایک سال سے زائد ہو جاتی ہے اس میں صحیح اور غلط، اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔"[۶]

فرد کی تربیت اور کردار سازی کے لیے استاد اہم رکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحلیلِ نفسی کے نظریات فرد کے احساسات وجذبات کو قابو میں رکھنے کا اہم ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

معاشرے کے افراد کے منتشر جذبات، متضاد اور جارحانہ انداز کو تحلیلِ نفسی کے نفسیاتی علاج کے ذریعے ٹھیک کر کے ان کے والدین کا فرماں بردار اور معاشرے کا ایک اچھا انسان بنایا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں تحلیل نفسی کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔

جنس اور جنسی جبلتیں:

قوتِ حیات اور جسمِ انسانی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کی قوت کو تندرست اور محرک رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان زندگی کو اس طرز سے گزارے کہ فطری تقاضے پورے ہو سکیں۔ ذہنی ہیجان، منتشر خیالات، جنسی مسائل یہ تمام پہلو انسانی نفسیات میں اس حد تک اہم ہیں کہ ان پر اگر توجہ نہ دی جائے تو نفسیات متاثر ہوتی ہے۔ جہاں فرد کو بہت سے اور جسمانی واعصابی مسائل ومشکلات درپیش ہوتی ہیں وہیں ایک مسئلہ جنسی جبلت کا بھی ہے۔

ذہنی زندگی کا حیاتیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جبلت ایک ایسا تصور ہے جو ذہنی اور جسمانی زندگی کے درمیانی محاذ پر اس طرح موجود ہے جسے وہ جاندار کے اندر سے پھوٹنے والے محرکات کا طبیعیاتی نمائندہ ہو اور دماغ سے یہ مطالعہ کر رہا ہو کہ وہ جسمانی طلب کے لحاظ سے کام کرے۔

جبلت کے تصور سیاق وسباق کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی کچھ جزوی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً

۱۔ جبلت کا دباؤ
۲۔ جبلت کا مقصد
۳۔ جبلت کا معروض
۴۔ جبلت کا سرچشمہ

۱۔جبلت کا دباؤ:

اس سے مراد جسمانی حرکی پہلو ہے یعنی جبلی قوت کی مقدار یا عمل کے مطالبہ کی وہ حدود جن کا جبلت اظہار

کرتی ہے زور یا دباؤ ڈالنے کے عمل کی خصوصیت تمام جبلتوں میں مشترک ہے۔ یہی جبلت کی "اصل" ہے۔ ہر جبلت ایک عمل ہے۔ اگر ہم بے عمل جبلت کی بات کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جبلت جس کا مقصد بے عمل ہو جبلت بذاتِ خود بے عمل نہیں ہو گی۔

۲۔ جبلت کا مقصد:

اس کا مقصد بہر صورت آسودگی ہوتا ہے جو صرف جبلت کے سرچشمہ سے تحریک کی حالت ختم کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہر جبلت کا مقصد آخر غیر متبدل رہتا ہے لیکن اس مقصد کے آخر تک پہنچنے کے راستے مختلف ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جبلت کے بہت سے فوری یا درمیانی مقاصد ہوتے ہیں جو یا تو باہم دگر تبدیل ہوتے رہتے ہیں یا باہم تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں تحریر کی بنا پر ایسی جبلتوں کا علم بھی ہے جو اپنے مقاصد کے لحاظ سے گھٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسے عوامل کی صورت میں اظہار کرتی ہیں جن کو جبلتی آسودگی کی سمت کسی قدر بڑھنے دیا جائے لیکن اس کے بعد گھونٹ دیا جائے یا ان کا رُخ موڑ دیا جائے۔ ہم یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ ایسے عوامل خود بھی جزوی آسودگی کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔

۳۔ جبلت کا معروض:

وہ چیز جبلت کا معروض ہے جس کا تعلق یا ذریعہ سے جبلت اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ یہ جبلت کے سلسلے میں سب سے زیادہ تنوع چیز ہے اور ابتداً جبلت سے وابستہ نہیں ہوتی بلکہ صرف اس لیے وابستہ ہو جاتی ہے کہ کسی جبلت کی آسودگی مخصوص طور پر اسی چیز کے ذریعہ ممکن ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ معروض خارجی ہو۔ وہ فرد کے اپنے جسم کا حصہ بھی ہو سکتا ہے۔ جبلتوں کے تغیرات کے دوران جبلت کا معروض کئی کئی بار تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تبدیلی بھی تغیرات کے زیرِ اثر ہوتی ہے جن سے جبلتیں اپنے عرصۂ وجود میں گزرتی رہتی ہیں۔ ان تغیرات کی بنا پر اگر کوئی اور شے جبلت کی قائم مقام ہو جائے تو اس سے بے حد اہم کام سرانجام پاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک معروض بیک وقت کئی جبلتوں کی آسودگی کا ذریعہ بن جائے۔

ایڈلر(Adler)نے اسی مظہر کو "جبلت کا سنگم" کہا ہے۔ جبلت کا معروض سے مخصوص قسم کا قریبی لگاؤ "جبلت کا انجماد" کہلاتا ہے۔ انجماد عموماً کسی جبلت کی نشوونما کے ابتدائی دور میں ظاہر ہوتا ہے اور جبلت کی حرکی صلاحیت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کا آزادی اور بے تعلقی سے شدید تضاد ہوتا ہے۔

۴۔ جبلت کے سرچشمے:

اس کا مطلب ایسا جسمانی عمل ہے جو جسم کے کسی حصے یا عضو میں ظاہر ہوتا ہے اور جس کی تحریک ذہنی زندگی میں جبلت کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ عمل ہمیشہ ایک ہی کیمیائی نوع کا ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کے اخراج مثلاً کیمیائی قوتوں سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ جبلت کے سرچشموں کا مطالعہ نفسیات کے دائرے سے باہر ہے۔ اگرچہ جبلتیں ہمیشہ اور کلیتاً اپنے جسمانی سرچشموں سے متعین ہوتی ہیں لیکن ذہنی زندگی میں ہم انھیں صرف ان کے مقاصد کے ذریعے سے جان سکتے ہیں۔

عملیت اور بے عملی کے تضاد ایگو (عامل) اور معروض (خارجی دنیا) کے تضاد کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ عمل اور بے عملی کا تضاد بعد میں مردانہ اور زنانہ تضاد میں مدغم ہو جاتا ہے۔ مردانہ زنانہ کے تضاد کے نفسیاتی معانی صرف اتنے ہیں کہ مرد کا عمل سے اور عورت کا بے عملی سے تعلق ہے۔

بہت سے ادیب اور نقاد ایسے ہیں جنھوں نے جنس کے موضوع پر مقالات تحریر کیے ہیں۔ ان میں اہم نام "ہیولاک ایلس" کا ہے۔ ایلس نے طفلی جنس پر بات کی اس کے علاوہ سیگمنڈ فرائیڈ، کارل، اے مینیجر، ارنس آر، گریوز، تھریسے، بینڈک، کینتھ واکر اور ایڈورڈ سیٹر مارک وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان تمام مغربی نفسیات دانوں نے جنس کے موضوع کو مختلف انداز میں اپنے مقالوں میں پیش کیا ہے۔

ہیولاک ایلس کا خیال ہے:

> اپنے تمدن کے لحاظ سے ہمیں معلوم ہے کہ سماجی زندگی کے عام حالات کے تحت جنسی تحریک کی توانائی کا رخ ان تینوں راستوں کی طرف مڑتا ہے۔ ا۔ اس واضح اظہار کی تمام صورتوں کو دبا کر اس توانائی کو

بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں عضویت نارمل، یا ابنارمل صورتوں میں اس کی تسکین کرتی ہے۔ ۲۔ عارضی یا برائے نام جنسی تعلقات کو ذریعہ تسکین بنایا جاتا ہے۔ طوائف بازی اس کی مثال ہے۔ ۳۔ شادی کرلی جاتی ہے یعنی جنسی تعلقات کا وہ سلسلہ جسے اگر حالات اجازت دیں تو دائمی بنانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ اس میں جنس کے علاوہ دیگر مقاصد بھی شامل ہوتے ہیں۔[۷]

جنس کے تین حوالے ہیں۔ ان میں مرد، عورت اور بچے کی جنس شامل ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ انسانی کنبہ کی بقا اسی تکون کی مرہون منت ہے۔ ان اختراعات کے زیر اثر ہر دور اور ہر نسل کے مرد اپنی عورت اور پیدا ہونے والے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں۔ جنسیت پر مبنی ان جسمانی تعلقات کی بنیاد حیاتیات پر استوار ہے۔ اس معاشرتی زندگی کی اساس اقتصادی اور نفسی قدروں اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق پروان چڑھتی ہے۔

اسی طرح یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ دوسری جبلتوں کی طرح جنس کی جبلت بھی موجود ہے۔ جنسی جبلت کے حوالے سے مختلف نظریات و خیالات موجود ہیں۔

جبلی آسودگی جنسی خواہشات کی تکمیل ہی سے ممکن ہے۔ جنسی جبلت کا اظہار جوانی میں ہوتا ہے۔ عورت شادی کے بعد اس جبلت سے آگاہ ہوتی ہے۔ عورت کو شادی کے ذریعے ہی جنسی زندگی گزارنے کی صورت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

جنس سے یہاں محض جنسی اختلاط مراد نہیں ہے بلکہ جنس کو اس کے واضح تر مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ وہ جنس جو انسانی تمدن کی اساس اور جمالیاتی تجربات کی کثرت میں وحدت پیدا کرتے ہوئے فرد کو اس کی گہری آسودگی سے روشناس کراتی ہے جس سے وہ اخلاقی اور روحانی بلندیوں کو پالینے کے قابل ہوتا ہے۔[۸]

سماجی تہذیب کے فرد پر اثرات:

تہذیب کسی بھی فرد کی کردار سازی کرتی ہے۔ تہذیبی اسباب براہِ راست کسی بھی معاشرے میں موجود افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مختلف تہذیبوں میں فرد کا کردار مختلف انداز سے پرکھا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی ایک علاقے کی تہذیب میں فرد کو صحیح قبول کیا گیا ہے تو دوسری تہذیب بھی اس کو من و عن قبول کرے۔

یہاں تک کہ شہری اور دیہی زندگی میں تہذیبی و سماجی اثرات کو الگ الگ قبول کیا جاتا ہے۔ ہر تہذیب و سماج کے اپنے موروثی اصول و ضوابط ہوتے ہیں اور وہ اس تہذیب کے افراد کو متاثر کرتے ہیں:

> سماجی بد نظمی، انتشار، مالی محرومیاں اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے دوسرے ناپسندیدہ حالات ان خاص سماجی و تہذیبی عوامل میں سے ہیں جو نفسیاتی امراض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔[9]

سماجی و معاشرتی عوامل میں تہذیبی طبقاتی نظام، ذہنی نفسیات، رہن سہن اور دوسرے کئی ایسے پہلو کسی بھی معاشرے کے فرد کے حیاتیاتی عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک لکھاری ان تمام پہلوؤں سے آگاہ ہوتا ہے اور وہ اپنی کہانیوں میں انہی موضوعات کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ معاشرے میں موجود افراد، ان کا ماحول اور سماجی رکاوٹیں فرد کے لیے ہیجانی تحریکات کا باعث بنتی ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں موجود افراد کی شخصی تشکیل میں یہی سماجی و تہذیبی عوامل کار فرما ہوتے ہیں جو اس کی شخصیت کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ سماجی تہذیب اور ماحول کا فرد پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس ماحول میں شخصی ذات، سماجی اور معاشی طبقہ، قومی تہذیب، رسوم و رواج اور سماجی عوامل تمام موجود ہوتے ہیں۔

ہم انسانوں میں تخریبی رجحانات دریافت کر لیتے ہیں تو تہذیب کا مسئلہ مادی نہیں رہتا نفسی بن جاتا ہے۔ جس طرح تہذیبی کاموں میں استبداد ضروری ہے اسی طرح یہ ممکن نہیں کہ عوام کی حکومت اقلیت کے ہاتھ میں نہ ہو کیوں کہ عوام سست اور کند ذہن واقع ہوئے ہیں، وہ اپنی جبلی خواہشات سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی دلیل سے قائل ہوتے ہیں۔ افراد افراتفری پیدا کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ عوام کے اصلاح اور تہذیبی اقدار کی فلاح

کے لیے ضروری ہے کہ کوئی رہنما مثال حیثیت اختیار کرے اور لوگ اس پر یقین رکھیں۔ پھر حالات کسی حد تک سازگار ہو سکتے ہیں۔ فرائیڈ قنوطیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اگر نئی نسل کی پرورش شفقت سے کی جائے تو دل میں استدلال پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں افراد تہذیبی اقدار کے لیے قربانی دے سکتے ہیں۔

انسانی تہذیب سے فرائیڈ کی مراد تمام وہ صورتیں ہیں جو انسان کو حیوانی حالت سے بلند کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ انسان وحشی حیوانوں سے کس طرح ممتاز ہے۔ اگر ہر تہذیب کو استبداد اور جبلی جبر کی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو انسان کے اندرونی تصادم سے نجات ملنے کے ساتھ ساتھ یہ امکان روشن ہو جاتا ہے کہ تمام تر قوتِ فطرت کو پرکھنے میں صرف ہو۔

تہذیبی مقاصد کو حاصل کرنے کا سیدھا سادھا طریقہ یہ بھی ہے کہ عوام کو جبلی خواہشات پور کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اس طرح جبلی خواہشات ناآسودہ ہو جائیں گی۔ انسان کی تہذیبی تاریخ ممنوعات اور ناآسودگیوں پر مشتمل ہے۔ فرائیڈ کا کہنا ہے کہ جوں جوں انسان ناآسودہ ہوتا ہے وہ مہذب ہوتا جاتا ہے۔

اگر فرائیڈ کے نظریات کے زیرِ اثر وجود میں آنے والے ادب پر بات کی جائے تو یہ دور اخلاقی و تہذیبی زندگی کے لیے تباہ کن سمجھا گیا۔ فرائیڈ نے تنقید کرنے والے اہل قلم کے جواب میں کہا:

بھوک جو جنس سے قوی جذبہ ہے۔

اس نے جنسی استحصال کی چھاؤں میں جنم لینے والے افسانوں کو گرد راہ بنا کر چھوڑ دیا۔ قحط نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ بھوک ہر ادبی تحریک کی اصل حقیقت کو عریاں کر کے پیش کر دیتی ہے۔ اس لیے اس کے مقابلے میں جنس محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کسی بھی شخصیت کے کردار کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ذہن کسی حد تک "بھوک" سے آزاد رہ کر جنس اور اس کے تعمیری عوامل اور نفسیاتی بصیرت سے مدد حاصل کرے۔

ش۔ اختر پیٹ کی بھوک کے ساتھ ہی جنس کو بھی بھوک قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف اردو افسانے

میں لس بین ازم میں رقم طراز ہیں:

> ادب اور آرٹ کا سارا کلاسیکی سرمایہ جنس کے بنیادی تصورات، محرکات اور ہیجانات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ یہ کسی ایک زبان یا کسی ایک قوم کے آرٹ تک محدود نہیں بلکہ ساری زبانوں کا جائزہ لینے کے بعد یہی حقیقت سامنے ابھرتی ہے۔[10]

ڈی ایچ لارنس جنس اور حسن کو ایک ہی شے قرار دیتے ہیں۔ اس کو ناقابلِ تقسیم مانتے ہوئے کہتے ہیں:

> جو ذہانت جنس اور حسن سے وابستہ ہے اور جنس اور حسن سے جنم لیتی ہے وہی وجدان ہے۔ ہماری شاندار تہذیب کی فنا کا باعث جنس سے مریضانہ نفرت ہے۔ اگر ہماری تہذیب ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ جنسی کشش کا مناسب اور نفیس اظہار کس طرح کیا جانا چاہیے اور جنسی جذبے کو اظہار اور قوت کے گوناگوں پہلوؤں سے کیسے قائم و دائم رکھا جاسکتا ہے تو ہم ایک بہتر زندگی بسر کرتے، یعنی ہم میں زندگی کی حرارت ہوتی اور ہم ہر طرح سے ہر فرض کی ادائیگی میں جذبے کی شدت کو محسوس کرتے لیکن اب زندگی سرد راتوں کی طرح تاریک ہو چکی ہے۔[11]

تمام تحریکوں کا اثر یہ ہوا کہ جنس جو شجرِ ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتی تھی، اب اس کا ذکر معیوب نہ رہا۔ ادب کی قدریں بدلیں جنسیات کے دائرۂ کار کو نفسیات کا حصہ سمجھا جانے لگا۔ انسان کو اس کے شعور کے پردے پر اور اس کے لاشعور کے نہاں خانوں میں تلاش کیا جانے لگا۔

نفسیاتی تجزیے کے لیے جن باتوں کی اہمیت و ضرورت ہوتی ہے اس ضمن میں سازگار حالات و واقعات اور فرد کے ذاتی اختیارات اور احساسات کا تعلق اور یہ ساری باتیں سماج سے گہرا ربط بھی رکھتی ہیں۔ یا تو ان کو چھپایا جاتا ہے یا ظاہر کیا جاتا ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کے ذریعے آپ سنی سنائی باتوں اور زبانی باتوں کے ذریعے تجزیہ نفس کر کے حقائق جان سکتے ہیں۔ افراد کا ذہنی رویہ کچھ ایسا بنا دیا جاتا ہے کہ جسم نامی کے اعمال اور اخدال کو تجزیاتی اساس دیکھیں، انھیں کیمیائی اور طبعی اصلاحات میں بیان کریں اور حیاتیاتی زاویہ نگاہ سے جانچیں لیکن آپ کی دل چسپی کبھی زندگی کے ذہنی پہلو کی طرف نہیں گئی۔ حالانکہ اس میں ایک حیرت انگیز اور پیچیدہ وجود نامی اپنی بلندیوں پر پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذہن کا

نفسیاتی رجحان آپ کے لیے ایک اجنبی چیز ہے اور آپ لوگ اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسے سائنسی فیک نہیں سمجھتے۔ آپ کے خیال میں یہ چیز فقط عوام شاعروں، صوفیوں اور فلاسفروں کے لیے ہے۔ یہ تنگ نظری طبّی قابلیت کے لیے نقصان دہ ہے۔

نظری فلسفہ، تشریحی نفسیات یا تجزیاتی نفسیات کا مطالعہ اس کے علم اعمال کے سلسلے میں کیا جاتا ہے میں سے ایک بھی جسم کے تعلقات کے بارے میں مفید معلومات نہیں دے سکتے اور نہ ذہنی اعمال کے خلل کے متعلق آپ کو کوئی راستہ دکھا سکتے ہیں۔

تجزیہ نفس کے ناپسندیدہ مسائل میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ذہنی اعمال لازماً غیر شعوری ہوتے ہیں۔ وہ محض منفرد اور تنہا افعال کی حیثیت رکھتے ہیں اور پورے نفسیاتی عمل کے محض اجزا ہوتے ہیں۔ ہم اس کے برعکس ذہنی اعمال کو شعوری اعمال سمجھنے کے عادی ہیں۔ شعور ایک ایسی خصوصیت ہے جو ذہنی زندگی کی تعریف کرتی ہے اور ہم نفسیات کو شعور کے مافیہ کا مطالعہ سمجھتے ہیں۔ یہ بات اتنی بدیہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی تردید ایک صریحی بے ہودہ ہے۔

تجزیہ نفس نے ذہن کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے کہ "ذہن محسوس کرنے اور سوچنے اور خواہش کرنے کے اعمال کا مجموعہ ہے اور تجزیہ غیر شعوری تفکر اور غیر شعوری خواہش کے وجود کو مانتا ہے۔

دوسرا مسئلہ جو تجزیہ نفس کی دریافتوں میں سے ایک ہے یہ دعویٰ کہ ہیجانات جنہیں ہر لحاظ سے صرف جنسیاتی کہا جائے گا اعصابی اور ذہنی بیماریوں کے سلسلے میں بہت زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ اس سے قبل ان کو پوری طرح قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ ان جنسیاتی ہیجانات نے انسانی ذہن کے تہذیبی فنی اور سماجی کارہائے نمایاں میں حصہ لیا ہے۔ تہذیب کے لیے ابتدائی ہیجانات کی تسکین کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو ایک مشترک اچھائی کے لیے جبلی مسرتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے اس طرح جو جبلی قوتیں کام آتی ہیں۔ ان میں جنسی جبلتیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ قوت اپنے جنسیاتی مقصد سے ہٹ کر ایسے مقاصد کی طرف ہو جاتی ہے جو سماجی طور پر زیادہ قابل قدر اور اہم ہوتے ہیں یہ نئی صورت غیر محفوظ ہوتی ہے۔

سماج کے تمدن کو سب سے زیادہ خطرہ جتنا جنسی ہیجانات کے ازاد ہو جانے سے ہوتا ہے اتنا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ جنسی جبلت کی قوت کو تسلیم کیا جائے اور فرد کی جنسی زندگی کی اہمیت کو ظاہر کر دیا جائے تو ایسا کرنا سماجی مفاد کے خلاف ہے۔

الفریڈ ایڈلر کا شمار نفسیات کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ فرائیڈ کے تحلیل نفسی کے دائرے میں شمولیت کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنے اساسی نظریات کے اختلاف کی وجہ سے ان نظریات سے علیحدہ ہو گیا۔

اس نے انفرادی نفسیات کی بنیاد رکھی۔ ایڈلر نے عضویاتی کمزوری کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے احساس کمتری کو واضح کیا۔ ایڈلر مذہبی عقائد و نظریات، معاشرے میں جنسیت اور ارد گرد کے ماحول کو بھی احساس کمتری کے ذمے ڈالتا ہے۔ اُس نے فرائیڈ کی طرح جنس کو اہمیت دینے کی بجائے جنسی تسکین کو خوشگوار تعلق سے جوڑا ہے۔ اس نے دو فریقوں کی باہمی رضامندی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جنسی آسودگی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں فریق رضامند ہوں ورنہ جنسی تسکین کا حصول ممکن نہیں۔

ایڈلر نے ایذا پسندی اور اذیت پرستی جیسے عناصر کو جنسی کج روی کی وجہ قرار دیا۔ نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> ایڈلر کے خیال میں ازدواجی زندگی کی بھرپور مسرت کا راز یہ ہے کہ فریقین کا جسمانی تعلق ممکن ذہنی ہم آہنگی کی بنیاد پر قائم ہو۔ [12]

فرائیڈ اور ایڈلر کا ہم عصر کارل یونگ ہے۔ مذہب کی تعلیمات کے اثرات سے متاثر ہو کر اور تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد یونگ نے جدید اور قدیم تہذیبوں کے ساتھ ساتھ مردہ تہذیب و تمدن کا مطالعہ بھی کیا۔ تمام علوم کے بعد اس نے اجتماعی لاشعور اور موت کی کشش جیسے نظریات پیش کیے۔

یونگ کے نزدیک انسانی شخصیت کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ بیرون بین

بیرون بین:

بیرون بین یعنی خارجی کائنات میں دل چسپی لینے والے افراد جو اعتماد سے بھرپور اور زندگی میں لطف اور دل چسپی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ افراد بیرونی عوامل اور ماحول سے مطابقت رکھتے ہوئے اپنی زندگی کو خوش گوار انداز سے گزارنے کے قائل ہوتے ہیں۔

اندرون بین:

اپنی ذات تک محدود، ماحول سے ڈرے سہمے، شرمیلے، احساس کمتری کا شکار ایسے افراد جو اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے ہیں ارد گرد اور ماحول سے قطع تعلق اپنی الگ خیالی دنیا بسائے زندگی کی منازل طے کرتے ہیں۔

یونگ فرائیڈ کے لاشعور کے نظریے کو تسلیم کرتے ہوئے اجتماعی لاشعور کا معترف ہے۔ مگر وہ فرد کی تمام تر الجھنوں اور مسائل کو صرف جنس سے وابستہ نہیں کرتا۔ اس کے مطابق ذہنی الجھاؤ صرف جنس کی کج روی کی وجہ سے نہیں بلکہ اور بھی بہت سے سماجی اور معاشرتی عوامل اس کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں۔

یونگ کے مطابق انسانی لاشعور پر چھائیوں کا ایسا منبع ہے جس کے پیچھے بہت سی ناجائز خواہشات اور ہیجانات کا عمل دخل ہے۔

دوستوفسکی ایک ناول نگار جس کا تعلق روس کے متوسط طبقے سے تھا۔ اس کی تحریروں میں نفسیاتی شعور واضح صورتوں میں ملتا ہے۔ جہاں اس کے دور میں اس کے ہم عصر افسانہ نگار اور ناول نگار اشرافیہ کے طرزِ حیات کو اپنی تحریروں میں برت رہے تھے وہیں دوستوفسکی نے عام، معمولی، شکستہ انسانوں کی سسکتی اور دم توڑتی آرزوؤں کی نوحہ سرائی کی ہے۔

اس کی تحریروں پر فلسفہ و نفسیات کا گہرا اثر تھا۔

اس ضمن میں نجیبہ عارف لکھتی ہیں؛

> دوستوفسکی کی تحریروں میں فلسفہ و نفسیات کا گہرا تال میل نظر آتا ہے۔ اس نے انسانی فطرت کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور فرد کے تحت الشعور میں چھپی خاموش اور سلگتی ہوئی تمناؤں کو منظرِ عام لایا۔ وہ نفسِ انسانی کی گہری اور پُراسرار تاریکیوں میں اترا اور ظاہر و باطن کے تضادات کو محسوس کر کے حیران رہ گیا۔ اس کی تحریروں میں مذہبی اعتقادات، فلسفیانہ نقطۂ نظر اور معاشرتی اقدار کے جبر سے پیدا شدہ مختلف النوع تاثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے انسانی ذہن کے اس مریضانہ رجحان کا تجزیہ کیا جو پاگل پن، خودکشی اور اقدامِ قتل جیسے نتائج کا محرک بنتا ہے۔ کمتری، ذلت، مظلومیت اور مغلوبیت کے احساسات جس تباہ کن اور وحشت ناک صورتِ حال کو جنم دیتے ہیں اس کا دقیق جائزہ دوستوفسکی کے تحریروں میں نظر آتا ہے۔ [۱۳]

ممتاز مفتی کا نفسیات اور نفسیاتی علوم سے گہرا تعلق ان کی تحریروں میں واضح نفسیاتی شعور کی صورت میں ابھرتا ہے۔ دراصل ممتاز مفتی فرائیڈ، ہیولاک اور ایلس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان ہی کے زیرِ اثر لکھتے ہوئے وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی باطنی پیچیدگیوں اور ارادوں کو دکھاتے ہیں۔ در حقیقت ممتاز مفتی نے جنس کے پیچھے کارفرما عوامل کی جستجو کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جنسی جذبہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے اور ناگزیر بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادباء نے انسانی رشتوں اور نفسیات کی الجھنوں کا حل تلاش کرتے ہوئے جنس کی اہمیت اور نفسیاتی مسائل کو اپنے بے شمار افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

اس حوالے سے نجیبہ عارف رقم طراز ہیں:

> فرائیڈ کی طرح ممتاز مفتی بھی جنس کو انسانی فطرت کا سب سے زیادہ قوی اور ناقابل تردید رجحان قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی جنسی جذبے کا تعلق محض ایک مخصوص فعل یا جنسی عمل سے نہیں بلکہ یہ افراد کی پوری زندگی میں جاری و ساری تخلیقی رو کی توانائی کا نام ہے۔ ممتاز مفتی کے خیال میں اس تخلیقی توانائی کا مثبت تعمیری مصرف تلاش کیے بغیر انسانی مسرت و نشاط کا حصول ناممکن ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں اس جذبے کی تسکین قدرے پیچیدہ صورتِ حال میں الجھی ہوئی ہے۔ [۱۴]

ممتاز مفتی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے جنس اور نفسیات کے موضوع پر لکھا ہے۔ یہی وہ بنیادی تقاضے ہیں جن کو مفتی صاحب نے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ممتاز مفتی نے اپنے مجموعے ان کہی کے دیباچہ میں لکھا ہے:

> اس مجموعے کی بیشتر کہانیوں میں نفسِ لاشعور کے کسی نہ کسی پہلو کے اظہار کی کوشش کی گئی ہے اور نفسِ لاشعور کا اظہار ہی میرے مصنف بننے کا جواز یا بہانہ ہے۔ یہ موضوع ایک بے حد الجھا ہوا بکھیڑا ہے۔ بہر حال اگر میں نفسِ لاشعور کے "ابوالہول" کی پراسرار قسم کی جھلک نہیں دکھلا سکا تو بھی مجھے تسکین ہے کہ میں نے اس اہم اور دقیق موضوع پر لکھنے کی جرأت اور کوشش کی۔ چاہے یہ کوشش ناکام کیوں نہ ہو کیوں کہ مجھے امید ہے کہ شاید یہ کوشش اک اشارے کا کام کرے اور کسی بہترین فن کار کو اس موضوع پر لکھنے پر اکسائے اور اک دن ہمیں نفسِ لاشعور کی پراسرار مگر رنگین جھلک دیکھنا نصیب ہو۔[۱۵]

نئی سماجی حقیقتوں کے ادراک کے اظہار کے لیے جنس کو وسیلہ بنانے کے حوالے سے ہر ادیب کا اپنا نقطۂ نظر اور اندازِ بیان ہوتا ہے۔ محبت اور جنس کے موضوعات، انسانی رویوں، ماحول اور تہذیبی اثرات کو بدل بدل کر لکھاریوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ مغربی ادیبوں کے افکار اور فلسفہ سے متاثر ہو کر ممتاز مفتی کے علاوہ بھی اور بہت سے ادیبوں نے جنس اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی کے لیے خود کو وقف کیا۔ ان نام ور لکھاریوں میں محمد حسن عسکری، آغا بابر، قدرت اللہ شہاب، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ شامل ہیں۔ ادب میں ان نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کو پیش کرنے کے مختلف رجحانات سامنے آئے ہیں۔ اس ضمن میں وزیر آغا نے لکھا ہے:

> ایک رجحان تو سپاٹ پن کی حد تک حقیقت نگاری کا رجحان تھا۔ اس کا سب سے بڑا علم بردار حسن عسکری تھا۔ نفسیاتی مطالعہ کے دوسرے بڑے رجحان کا علم بردار ممتاز مفتی تھا۔ ممتاز مفتی نے نہ صرف کردار کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کی، بہت سی الجھنوں کو سطح پر لانے کی کوشش کی، بلکہ اس نے کردار کی تعمیر میں کشادگی اور رفعت کو ملحوظ رکھا۔[۱۶]

ممتاز مفتی کے افسانوں میں نظر آنے والے مختلف نفسیاتی نظریات فرد کے لیے معاشرے کی روایات تہذیب و ثقافت معاشی و معاشرتی قدروں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ انسانی عادات و اطوار، انسانی نفسیات فرد کے داخلی و

خارجی نظریات اور اس کے تہذیب و تمدن پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی نفسیات سے آگاہی سے پہلے فلسفۂ حیات کا جاننا ضروری ہے۔ یوں تو انسانی نفسیات سے متاثر ہو کر بہت سے فلسفیوں نے اس موضوع پر بحث کی۔ نفسیات نے جہاں مغرب سے آغاز کیا وہیں برصغیر میں لکھنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں اس موضوع پر لکھا تو ان کے نفسیاتی نظریات واضح ہونے شروع ہو گئے۔

نفسیاتی رجحان کے زیرِ اثر لکھنے والوں نے نفس لاشعر جنسی رویوں کی تشکیل، اخلاقی نظریات، انسانی نفسیاتی اور جنسی احساسات اور جذبات جیسے موضوعات کو اپنے ہاں جگہ دی۔ انھی بہت سے لکھاریوں میں ایک نام ممتاز مفتی کا بھی ہے جنھوں نے باقاعدہ نفسیات کا مطالعہ کیا اور خاص طور پر ہیولاک، ایلس، فرائیڈ، یونگ، دوستوفسکی جیسے بڑے فلاسفر کا اثر قبول کیا۔

ممتاز مفتی نے تحلیل نفسی، لاشعور، معاشرتی و معاشی رکاوٹوں، اخلاقی نظریات جیسے موضوعات پر اپنے افسانوں میں قلم سرائی کی۔ ایک فنکار کی تخلیقی زندگی پر بہت سے رجحانات کا اثر ہوتا ہے۔ زندگی کے تجربات و مشاہدات، معاشی اور معاشرتی روایات انسانی رویے اور انسانی نظریات اس کے ارتقائی سفر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ممتاز مفتی کے افسانوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو نفس شعور اور لاشعور، جنس اور جنسی جبلت، تحلیل نفسی اور سماجی تہذیب کے اثرات جیسے موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

نفسیاتی نظریات کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ سماجی معاشرتی عوامل میں تہذیبی طبقاتی نظام، ذہنی نفسیات، رہن سہن اور دوسرے ایسے کئی پہلو کسی بھی معاشرے کے فرد کے حیاتیاتی عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ کسی بھی فرد کی شخصی تشکیل کے لیے سماجی و تہذیبی عوامل اہم ہوتے ہیں۔ سماجی تہذیب اور ماحول کا فرد پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس ماحول میں ذات، سماجی اور معاشی طبقہ، قومی تہذیب، رسوم و رواج اور سماجی عوامل تمام موجود ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تمام ایسے لوگ جن کو انسانی نفسیات نے متاثر کیا۔ وہ ان تمام عوامل کی کارفرمائی پر یقین رکھتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے ہاں نظر آنے والے نفسیاتی رجحانات کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مفتی

صاحب دراصل فرائیڈ، ہیولاک، ایلس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان ہی کے زیرِاثر لکھتے ہوئے وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی پیچیدگیوں اور ارادوں کو دکھاتے ہیں۔ درحقیقت ممتاز مفتی نے جنس کے پیچھے کارفرما عوامل کی تگ ودو کی ہے۔ ان حقائق سے پہلوتہی ممکن نہیں کہ جنسی جذبہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے اور ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادباء نے انسانی رشتوں اور نفسیات کی الجھنوں کا حل تلاش کرتے ہوئے جنس کی اہمیت اور نفسیاتی مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ممتاز مفتی اس حوالے سے اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں کہ انھوں نے جنس اور نفسیات کو موضوع بنایا۔ یہی وہ بنیادی تقاضے ہیں جن کو مفتی صاحب نے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔

حوالہ جات

۱۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۱۷۸۔

۲۔ آصف حسن،سگمنڈ فرائڈ:حیات و نظریات(کراچی: بک ٹائم،۲۰۱۵ء)،ص۱۸۲۔

۳۔ ایضاً،ص۱۶۴۔

۴۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۱۷۸۔

۵۔ آصف حسن،سگمنڈ فرائڈ:حیات و نظریات،ص۱۵۴۔

۶۔ ایضاً،ص۱۵۸۔

۷۔ نیاز احمد،ڈاکٹر سلیم اختر بہ حیثیتِ نقاد،ص۱۹۶۔

۸۔ ایضاً،ص۲۰۲۔

۹۔ ایفرم زون،ابنارمل نفسیات،مترجمہ:ذکیہ مشہدی(نئی دہلی: قومی کونسل برائے اردو،۱۹۸۵ء)، ص۲۱۷۔

۱۰۔ ش اختر،اردو افسانے مینلس بین ازم(گیا: کلچرل اکیڈمی،۱۹۷۷ء)،ص۵۲۔

۱۱۔ دیویندر اسر،ادب اور نفسیات(۱۹۶۳ء)،ص۱۱۹۔

۱۲۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۱۸۹۔

۱۳۔ ایضاً،ص۱۹۷۔

۱۴۔ ایضاً،ص۱۷۸۔

۱۵۔ ممتاز مفتی، مفتیانے،ص۸۔

۱۶۔ وزیر آغا،اردو افسانے کے تین دور،تنقیدی مقالات،(حصہ نثر)،ص۴۹۰۔

باب سوم:

ممتاز مفتی کے پہلے دور کے منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا

(۱۹۳۶ء۔۱۹۶۵ء)

باب سوم:

ممتاز مفتی کے پہلے دور کے منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا

(۱۹۳۶ء۔۱۹۶۵ء)

اردو میں مختصر افسانہ بیسویں صدی میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ صنف مشرقی مزاج سے ایسے ہم آہنگ ہوئی کہ اس پر مغربی صنف ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری کے آغاز میں ہمیں رومانوی اور اصلاحی رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حقیقت پسند رجحان جس میں اصلاحی انداز پایا جاتا تھا اس کے بانی پریم چند ہیں۔ اپنے افسانوں کے ذریعے پریم چند نے معاشرے کی اصلاح کے پہلو کو اُجاگر کیا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں یہ رجحان پریم چند کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، حکیم احمد شجاع، سلطان حیدر، جوش، حجاب امتیاز علی اور مجنوں گورکھپوری کے یہاں بھی پایا جاتا تھا۔

بعض افسانہ نگاروں کو سیاسی و سماجی موضوعات میں دلچسپی تھی جبکہ بعض کو روس میں بڑھتے ہوئے اشتراکیت کے رجحان سے نئے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا موقع ملا۔ کچھ نے کارل مارکس اور بعضوں نے سگمنڈ فرائیڈ کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے افسانے لکھے۔ انہی لوگوں میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر نے ۱۹۳۲ء میں اپنے افسانوں پر مشتمل ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے پیش کیا جو اجتماعی اور انقلابی قرار پایا۔

ان کے افسانوں میں نہ صرف بے باکی اور صاف گوئی تھی بلکہ فنی اعتبار سے افسانے کی ترقی یافتہ شکل بھی ابھر کر سامنے آئی۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ اس تحریک کے منشور نے بہت سے لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ تخیلاتی اور رومانوی دنیا سے نکل کر لوگوں نے حقیقت کی دنیا کو دیکھنا شروع کیا۔ مذہبی اجارہ داری، طبقاتی نظام، نسلی برتری، آمریت، معاشی و معاشرتی رکاوٹوں اور نفسیاتی مسائل سے متعلق ادیبوں نے قلم سرائی کا آغاز کیا۔ غلام عباس کا آنندی، اوپندر ناتھ کا بینگن کا پودا، احمد علی کا ہماری گلی، سعادت حسن منٹو کا ہتک اور نیا قانون، بیدی کا گرم کوٹ، حیات اللہ انصاری کا آخری کوشش جیسے قابل ذکر افسانے لکھے گئے۔

اردو افسانے میں تکنیک اور موضوع دونوں اعتبار سے ترقی ہوئی۔ ایسے وقت میں لکھنے والوں میں محمد حسن

عسکری، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، رام لعل، شفیق الرحمٰن، قدرت اللہ شہاب، بانو قدسیہ، سید انور اور انتظار حسین وغیرہ نے فکر و فن سے ہم آہنگ ہو کر افسانوی ادب میں نئی راہ نکالی۔

۱۹۴۷ء کی آزادی اور ہجرت نے اردو ادب کو متاثر کیا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ کا سامنا شعرا اور ادبا کو بھی کرنا پڑا جس کے اثرات ان کی تحریروں پر بھی مرتب ہوئے۔ ان حالات و واقعات میں لکھنے والوں نے سماجی حقائق، جنسی موضوعات اور دوسرے معاشرتی مسائل جیسے موضوعات کے علاوہ ذہن و لاشعور اور ماحول و کردار پر افسانے لکھ کر نئے تجربات کا آغاز کیا۔

افسانہ جس زمانے میں فکر و فن اور تکنیک کے لحاظ سے سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کے ذریعے پہچانا جا رہا تھا، ممتاز مفتی نے بھی اسی زمانے سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ جب رومانویت اور حقیقت نگاری عروج پر تھی ایسے وقت میں ممتاز مفتی نے انسانی نفسیات کو اپنے موضوع کا حصہ بنایا۔ اردو افسانے پر مغربی مفکرین فرائیڈ اور مارکس کے فلسفہ و نفسیات کے اثرات پڑھ رہے تھے۔ ترقی پسندی، تحلیلِ نفسی اور تحت الشعور کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر افسانے لکھے جا رہے تھے۔ ممتاز مفتی خود بھی چونکہ تحلیلِ نفسی کے موضوع سے متاثر تھے چنانچہ انھوں نے فرائیڈ کی نفسیات کا مطالعہ جنسیات کی عینک لگا کر کیا۔

ممتاز مفتی کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو نے جنس اور نفسیات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ منٹو اپنے افسانوں میں جنس کے موضوع پر بات کرتا ہے تو اس کے کردار کھل کر اور چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کے برعکس ممتاز مفتی کے یہاں جنسی مسائل کے سبب محرومی اور گھٹن کا دبا دبا اظہار پایا جاتا ہے۔ ممتاز مفتی نے بے جا جنسی پابندیوں پر کھل کر بات کی ہے مگر اس کھلے اظہار میں بھی عریانیت کا عنصر نہیں ملتا۔ یہی وہ فنی خوبی ہے جو ممتاز مفتی کو منٹو سے الگ کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ بدنام نہیں ہوئے۔ ممتاز مفتی کے ہر افسانے کی عورت کسی نہ کسی شکل میں اپنی انفرادیت اور لاشعور میں پوشیدہ محرکات کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا در اصل ان کے ذہنی سفر کا ارتقا ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی طور پر معاشرتی مشاہدے کے نتیجے میں اخذ ہوتا ہے۔ ارد گرد کا ماحول جس تیزی سے بدلتا ہے ایک لکھاری کی سوچ کو

بھی اسی تیزی سے متاثر کرتا ہے۔ یہ تمام احساسات اور خیالات جو ہمیں بدلتے نظر آتے ہیں ان کا اندازہ ایک مصنف کی لکھی ہوئی اُس دور کی تحریر سے لگایا جاتا ہے۔

ممتاز مفتی کی ذاتی زندگی، معاشرتی مشاہدات نے ان کی تحریروں پر اثر ڈالا۔ اپنے افکار و خیالات نے ان کو جدت بخشی۔ مفتی صاحب کے ابتدائی رجحانات و نظریات میں بھی ان کی ذاتی زندگی، گھریلو ماحول، عزیز و اقارب، معاشرتی رجحانات اور سماج میں ہونے والے تغیر و تبدل شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی سوچ جو ان کی عمر کے ساتھ پروان چڑھتی رہی ہے نے بھی ان کی تحریروں کو متاثر کیا۔ اس ضمن میں ان کا ناول علی پور کا ایلی ان کی ذاتی زندگی کا عکاس ناول ہے۔

ممتاز مفتی کے ابتدائی افسانوی مجموعے ان کہی، گہما گہمی، چپ، اسمارائیں، گڑیا گھر میں جو فکری رجحانات ملتے ہیں ان میں مفتی صاحب مغربی مفکرین خاص طور پر سگمنڈ فرائیڈ، ایلس، یونگ، ایڈلر وغیرہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان میں سگمنڈ فرائیڈ سے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔

بعض فکری رجحانات ابتدا سے اختتام تک مصنف کی تحریروں میں موجود ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی کا متصوفانہ رجحان اور انسانی نفسیات دونوں ان کی تحریروں میں آخر تک موجود رہے۔ ہمارا موضوع چونکہ عورت کے ارتقا کے حوالے سے ہے تو ہم ممتاز مفتی کے افسانوں میں موجود عورت کے کردار اور اس کی نفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل پر بات کریں گے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں کی عورت ہمارے ارد گرد موجود ایسا کردار ہے جو خاموش، بے آواز، چپ چاپ نظر آتی ہے۔ ایسی خاموشی جس کے اندر صدیوں کی گھٹن کے خلاف احتجاج کی صدا نظر آتی ہے۔ انھوں نے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت اور اس کی ذہنی پریشانیوں اور نفسیاتی الجھنوں کا ایک کردار کے ذریعے اظہار کیا۔ ان کے موضوعات کے پس پردہ محرکات اور عورت کے کرداروں کی انفرادیت انھیں دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔

ان کے افسانوں کی عورتیں یا تو چپ چاپ، دل ہی دل میں کُڑنے والی ہوتی ہیں یا شوخ و چنچل، بے باک اور

مردوں کو دعوت التفات دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں جو نسائی دوئی دیکھنے کو ملتی ہے اس کی صحیح صورت ہمیں ان کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے نظر آئے گی۔

ممتاز مفتی اپنے فن کے متعلق رو غنی پتلے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> میری زندگی میں افسانے نے کئی ایک چولے بدلے پہلے ترقی پسندی کے تحت مزدوروں اور روٹی کپڑے کی بات چلی۔ ایسی چلی کہ فیشن بن گئی۔ سٹیٹس کا نشان بن گئی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میری تحریر بھی فیشنی ہو جائے میرا بھی سٹیٹس بن جائے لیکن میں خود کو محدود نہ کر سکا۔ اس لیے ناکام رہا۔ پھر خیال افروز کہانیاں آئیں جو سوچتی زیادہ تھیں۔ محسوس کم کرتی تھیں۔ سوچنا مجھ سے اپنایا نہ گیا۔ میرے نزدیک ادب سوچ نہیں جذبات ہیں جو انسان کو انسان کے قریب لاتے ہیں۔[1]

افسانہ آپـــا ان کے پہلے مجموعے میں شامل ہے۔ اس افسانے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا نفسیاتی مطالعہ بہت گہرا تھا۔ اس افسانے کا بنیادی موضوع احساسِ پشیمانی ہے۔ سجادہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی خاموش طبع، شرمیلی اور حساس دل کی حامل لڑکی ہے، جسے سب "آپا" کہہ کر بلاتے ہیں۔ ایک ایسی عورت جو انتہائی گھریلو قسم کی ہونے کے ساتھ ساتھ بے زبان اور اپنے احساسات اور جذبات سے اندر ہی اندر جنگ کرتی ہے۔ اس کے گھر تصدق جو اس کی پھوپھو کا بیٹا تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے رہائش پذیر ہے۔ آپا اس سے محبت کرتی ہے مگر اس کا اظہار نہیں کر پاتی۔ اس کے برعکس خالہ کی بیٹی ساجدہ (ساجو) اپنی شوخ و چنچل طبیعت کی بنا پر تصدق کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

آپا کی نسبت اس کی چھوٹی بہن جہنیا (نور جہاں) وہ لڑکی جو اشاروں کنایوں کی تہ تک پہنچ کر اسے ظاہر کرتی ہے۔ ممتاز مفتی نے آپا کی نفسیاتی کش مکش اور ذہنی الجھنوں کو جہنیا کے ذریعے باور کرایا ہے۔ افسانہ میں آپا کا مرکزی کردار ہے۔ حالات و واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں مگر افسانہ چھوٹی بہن جہنیا کے ذریعے شہرت کی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ وہ لاشعور میں چھپی خواہش کو شعور میں لا کر اس کی قدر و اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔

اندر ہی اندر جنگ کرتی لڑکی کے دیے ہوئے جذبات جو باہر سے راکھ اور اندر سے چنگاری کی مانند ہیں:

> بچّے اسے ہاتھ میں نہیں اُٹھاتے اس میں چنگاری ہے۔ وہ تو جلا ہوا ہے اماں بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔
> اماں بولیں "میرے لال تمھیں معلوم نہیں اس کے اندر آگ ہے۔" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی
> سُرخی دوڑ گئی۔[۲]

ایک لکھاری نے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں اسلوب اور کچھ الفاظ کو ترجیح دی ہوتی ہے جن کے ذریعے وہ تشبیہات اور استعارات سے انسانی نفسیات کا اظہار کرتا ہے۔ اس افسانے میں بھی ممتاز مفتی نے "آگ" اور "چنگاری" جیسے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے آپا کے چھپے ہوئے جذبات کو بیان کیا ہے۔ بعض اوقات اس طرح کی تشبیہات و استعارات استعمال کر کے لکھاری نفسی آسودگی حاصل کرتا ہے۔ اس عمل سے مصنف کی تصنیف میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس میں بھی لاشعوری مسائل کو شعور میں لا کر ظاہر کرنے کے لیے ممتاز مفتی نے اسی طرز کا انتخاب کیا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> آپا اس مجموعے کی پہلی کہانی ہے۔ یہ ممتاز مفتی کے مقبول اور نمائندہ افسانوں میں سے ہے۔ آپا کا
> موضوع ایک خاموش طبع اور شرمیلی لڑکی "سجادہ" کی جذباتی کیفیات کا بیان ہے..... کہانی کی آپا
> محض کردار نہیں ایک تہذیبی علامت بن کر نمودار ہوتی ہے۔[۳]

لاشعور میں مخفی خیالات کے علاوہ بھی کچھ ایسے خیالات ہوتے ہیں جن کے محرکات اور راہ متعین ہونے کے باوجود ان کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اس افسانے میں بھی ہے جہاں آپا تہذیب و روایات سے اس حد تک منسلک ہے کہ وہ اپنے جذبات کے برملا اظہار کی خواہش رکھنے کے باوجود خاموش رہتی ہے۔ یہ اس کی اپنی تہذیب و اقدار سے وابستگی ہے۔ وہ ایک باوقار اور فرماں بردار عورت کا کردار ادا کرتی ہے۔ اپنے چھپے ہوئے جذبے جو اس کے اندر سلگتے رہتے ہیں ان کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے۔ یہ عورت کی جنسی جبلت ہے جس کے ذریعے وہ اپنے جنسی جذبات اور احساسات کو دبائے رکھتی ہے۔ دوسری طرف مرد کی جنسی خواہشات جو عورت کے صرف جسم تک محدود ہیں اور ظاہری اظہار سے متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ عورت کی ظاہری خوب صورتی دوسری عورت (سجادہ) کی خوب سیرتی پر حاوی نظر آتی ہے۔ یہ کہانی نفسِ لاشعور اور انسانی جبلتوں کی عکاس ہے۔

اس افسانے میں نور جہاں کا کردار ایسا کردار ہے جو لاشعور میں جھانک کر تمام گمنام کارروائیوں کا ادراک کر لیتی ہے۔ لیکن اپنے نفسیاتی ہیجانات کے آگے مجبور ہے۔ اسی لیے وہ تمام باتیں دبا لیتی ہے۔

افسانہ آپــا میں تصدق کے کردار کے ذریعے ایسے لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو انگ انگ میں بسے ہوتے ہیں کبھی حوصلہ پیدا کر کے اظہار نہیں کرتے اور اگر ایسا کریں بھی تو بہت دیر گزر چکی ہوتی ہے جس کا بعد میں صرف افسوس ہی افسوس رہ جاتا ہے۔ تصدق نے اپنا گھر تو بسا لیا مگر دل میں اُداسی اور ویرانی کا ڈیرا ہے۔ اس افسانے کا اختتام بھی اسی نفسیاتی الجھن اور جنسی جبلت کے جذبے پر ہوتا ہے:

> نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا ہے جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔ "آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا" کتنی سردی ہے"۔ پھر اُٹھ کر آپا کے قریب چولھے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ "کیوں سجدے"۔ آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سے آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈک ہے۔[۴۲]

افسانے کے اختتامی پیرا گراف سے مردوں اور عورتوں دونوں کے جبلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ آپا کا کردار نفسیاتی اور جنسی جبلت کی عکاسی کرتا ہے۔ اپنے کردار کو بہت بااختیار بنا رکھا ہے۔ اپنے احساسات و جذبات کا برملا اظہار کرنے کی بجائے خاموش رہ کر آگ کو دل میں سلگائے رکھتی ہے۔ ویسے تو جنسی جبلت بچپن ہی سے سرگرمِ عمل رہتی ہے مگر اس کا برملا اظہار عنفوانِ شباب میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات جنسی جبلت کا تعلق شعور اور لاشعوری عمل کے ساتھ رہتا ہے۔ معاشرتی حدود و قیود کی وجہ سے شعوری طور پر بہت سی عورتیں اپنے جذبات اور احساسات کو کچل دیتی ہیں لیکن ان کے لاشعور میں ایک مسلسل جنگ رہتی ہے۔ یہی اس افسانے میں ہے جس میں ان چھپے ہوئے جذبوں کو چنگاری سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ممتاز مفتی کا افسانہ جھکی جھکی آنکھیں، ان کی ابتدائی زمانے کی کہانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ تاہم

ایک ہی دور میں لکھی جانے والی ہر تحریر میں لکھاری کی سوچ و فکر کے مختلف زاویے سامنے آتے ہیں۔ جھکی جھکی آنکھیں بظاہر ایک روایتی انداز لیے ہوئے ہمارے معاشرتی رجحانات کی عکاسی کرتی ہوئی کہانی ہے۔ اس میں بھی عورت کو روایتی انداز میں دکھایا گیا ہے۔ ایک ایسے معاشرے کی ترجمانی اس میں موجود ہے جس میں مرد کو ہی تمام اختیارات سونپے گئے ہیں۔ عورت ایسے اپنی زندگی بسر کرتی ہے جو دوسروں کی مرہونِ منت ہو۔ ایک ایسی عورت کی کہانی جو اپنے احساسات اور جذبات کو کچل دیتی ہے:

> عذرا کی بیداری کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا۔ وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان چند ایک ساعت کے لیے ان خاموش مہیب چٹانوں میں ابھر ابھر کر خاموشیوں کے مسکن کو اور خاموش اور بھیانک تر چھوڑ جاتی ہے۔[5]

دوسری طرف عذرا اپنے جذبات کو قربان کرتے ہوئے فرض کو ادا کرنا اپنا اوّلین مقصد سمجھتی ہے۔ اس کہانی سے ہمیں مصنف کے معاشرتی رجحانات اور خیالات کی پیشکش ملتی ہے۔ ممتاز مفتی کے ابتدائی افسانوں میں ان کے والدین کے ساتھ گزری زندگی کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔

ممتاز مفتی کے ہاں عورت ہمیشہ بہ طورِ موضوع سامنے آئی ہے۔ عورت کا کردار ان کے ہاں معاشرتی و سماجی روّیوں کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ نفسیاتی و نظریاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ افسانہ نفس لاشعور کا عکاس ہے۔ اس میں عذرا کا گوں مگوں انداز اور انسانی نفسیات کا الجھاؤ کا پہلو اور لاشعوری کیفیت فرائیڈ کے نفس لاشعور سے مطابقت رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر سگمنڈ فرائیڈ حیات و نظریات میں لکھتے ہیں:

> خواہشات اور ان کی آسودگی کے ضمن میں دباؤ، گریز، مراجعت اور امتناعات کی صورت میں انسانی سائیکی جس جنگ سے دوچار ہوتی ہے اس میں اعصاب پر جو گزرتی ہے اس کا مظاہرہ نفسیاتی مریضوں سے لے کر اعلیٰ ترین تخلیقی قوتوں کے حامل افراد تک سب ہی میں مل جاتا ہے۔[6]

نفسِ لاشعور کے یہ نکات اس افسانے کے اختتام میں عذرا کے کردار میں نظر آتے ہیں۔ جب وہ ہاں اور ناں

کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ خواہشات اور دباؤ اور خود سے جنگ سے دوچار ہے:

> عذرا کا دل چاہتا ہے کہ سلیم سے جا ملے۔ کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا۔ عذرا اُٹھ بیٹھتی اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ یا کیا کرنا چاہتی ہے..... عذرا کی ہچکیاں رُکتی نہ تھیں..... میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیا کر دیا۔ سلیم تم نہ جاؤ۔ سلیم سلیم! اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں..... پھر اس نے سُنا جیسے میلوں دُور کوئی کہہ رہا تھا۔ 'عذرا میری وفا کی دیوی'۔[۷]

اسی طرح خلط ملط جنس کے موضوع پر لکھی گئی کہانی ہے۔ اس میں بچہ اپنے گھر کے ماحول سے متاثر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں وہ اپنے قریبی رشتوں کی ایسی حرکات و سکنات کو محسوس کرتا ہے جو اس کو اچھنبے میں ڈالتی ہیں۔ ذو معنی گفتگو، اشارے، مشکوک حرکتیں جو اس کے لاشعوری اور شعوری عمل کو جھنجھوڑتی ہیں۔ (بچہ (مانی) اپنے بھائی کو تنہائی میں کچھ ایسا کرتے دیکھ لیتا ہے جو اس کے کچے ذہن کو گڈمڈ صورتِ حال سے دوچار کر دیتا ہے:

> دفعتاً کمرے کے دائیں کونے میں اس نے کپڑوں کی سرسراہٹ سُنی۔ وہ ٹھہر گیا۔ مڑا۔ سامنے بھائی جان میز کی طرف پیٹھ کیے کھڑے تھے۔ ان کے بازوؤں میں رنگ دار کپڑوں کا گٹھا تھا جو اوپر سے زمین تک پہنچتا تھا اور جس کے ایک سرے سے چوٹی لٹک رہی تھی..... بھائی جان کا سر جھکا۔ اور وہ کپڑوں کا ستون اور بھائی جان خلط ملط ہو گئے۔[۸]

اس کہانی میں بچے کی ابتدائی دور میں جنسی واقعیت کو موضوع بنایا گیا ہے کہ وہ کیسے جنسیت کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس میں بچہ والدین کی حرکات سے روشناس ہوتا ہے۔ کہانی خلط ملط میں بھی جنسی کشش اور جنسی جذبات کا چھپا اظہار موجود ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار بانو اور بھائی کا ہے جو جنسی جبلت کا شکار ہیں اور اپنی روایات اور تہذیبی پابندیوں کی وجہ سے کھل کر اظہارِ محبت نہیں کرتے اور اپنے جذبوں کی تکمیل کے لیے چور راستوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی رازدارانہ انداز (مانی) کو حیران کرتا ہے جو اس جنسی جذبے سے ناواقف ہے۔

رفیق جعفر سگمنڈ فرائیڈ حیات و نظریات میں یوں تحریر کرتے ہیں:

> فرائیڈ کی اہم ترین دریافتوں میں خاندان کا فرد کی شخصیت قائم کرنے میں بنیادی کردار ہے۔ خاندان اور

خاص طور پر باپ کا کردار بچے کی طرف جارحانہ رویہ، لاشعور کا انسانی زندگی میں اہم کردار اور بچے میں
ماں باپ کے ذریعے معاشرتی اقدار اور روایات کے منتقل ہونے کا طریقہ کار شامل ہیں۔[9]

مفتی صاحب نے اپنے اس افسانے میں ایسے ہی نکات کو موضوع بنایا ہے جس سے ہمیں یہ آگاہی ہوتی ہے کہ بچے کیسے لاشعوری طور پر والدین کی حرکات و سکنات سے متاثر ہوتے ہیں۔ جنسی طفلیت کا یہ افسانہ ہمیں بچے کے کردار میں ماں باپ کے ذریعے منتقل ہونے والے احساسات و جذبات سے آگاہ کرتا ہے۔

ماتھے کا تل بھی ممتاز مفتی کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں دیور بچپن سے ہی بھابھی کے لیے خاص انسیت محسوس کرتا ہے جو غیر معمولی جنسی کشش کے حامل جذبات کے زیرِ اثر ہے۔ ایسے میں وہ خود کو بہت اُلجھا ہوا محسوس کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف رشتے کا تقدس اور سماجی رُکاوٹیں ہیں تو دوسری طرف اس کے اندر پنپتی جنسی آرزوئیں ہیں جن کو وہ اپنی محبوبہ کے ذریعے بدل لینا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی جنسی جبلتوں کے ساتھ ایک جائز رشتے کو اپنا کر اپنی خواہشات اور پوشیدہ آرزؤں کی تکمیل چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی جبلت عام مقصد کے ساتھ ساتھ پوشیدہ اور خاص مقصد کے حصول کے لیے بھی کوشاں رہتی ہے۔ ایسی صورت میں دماغ مسلسل یہ تحریک دیتا ہے کہ جسمانی طلب کے مطابق کیا کیا جائے۔

افسانہ دور ابا مجموعہ چپ میں شامل لاشعوری خواہشات کا حامل افسانہ ہے جس میں ریلوے جنکشن پر موجود لوگوں کی گفتگو کے ذریعے سے انسانی جذبات اور احساسات کا بیان کیا گیا ہے۔ ایک ایسا دورویہ راستہ ہے جہاں سے ٹرین دو منزلوں کی طرف رواں دواں ہوتی ہے۔ ایک علاقہ عقیل پور کی طرف اور دوسرا پریم نگر کی طرف جاتا ہے۔ پریم نگر ایک ایسی بستی جہاں زیادہ تر عورتیں رہتی ہیں۔ اس افسانے میں کرداروں نے مکالمے کی صورت میں اپنے احساسات اور خیالات کا اظہار کیا ہے کہ کیسے انسان بظاہر معمولی انداز اپناتا ہے مگر درپردہ اس کے اندر لاشعوری خواہشات اور احساسات اور معاشرتی خوف موجود ہوتا ہے۔ اس افسانے میں معاشرتی جبلتوں کو مکالماتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اگر سگمنڈ فرائیڈ کے نظریہ لاشعور کا مطالعہ کریں تو اس بات سے آگاہی ہوتی ہے کہ تمام ذہنی اعمال لاشعور

سے شروع ہوتے ہیں۔ تمام جبلی حرکات کا دارومدار بھی عمل لاشعور پر ہے۔ زندگی کے روزمرہ کے واقعات کا تعلق بھی انہی ذہنی محرکات سے ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانے دور ابا میں بھی ہمیں لاشعور کے ایسے ہی محرکات دکھائی دیتے ہیں۔

باجی افسانے میں ممتاز مفتی نے آپا افسانے والی تکنیک کو اپنایا ہے۔ مگر دونوں کہانیوں کا خیال ایک ہوتے ہوئے بھی مختلف طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے قاری کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ اسی طریقہ کار کا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بھی جبلی خواہشات، معاشرتی دباؤ اور رسوم ورواج کی پابندیاں جو نفس انسانی کی خواہشات کی راہ میں رُکاوٹ ہیں ان کو پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کہانیوں کے لوازمات ایک ہونے کے باوجود خیال کو یکسانیت سے بچاتے ہوئے خوب صورت انداز اپنائے ہوئے ہیں۔

انسان تہذیبی قوتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں اس کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔ تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں اور بڑی ہوتی جاتی ہیں۔ جن شعوری خواہشات کو دبایا جائے وہ ہمیشہ لاشعور میں پناہ لیتی ہیں۔ کچھ اس کا اظہار کرتے ہیں، کئی کے ہاں یہ خواہشات ظاہری نفرت کا رُوپ دھار کے سامنے آتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان دبی ہوئی خواہشات کا اظہار چور راستوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ تاہم ممتاز مفتی کے افسانے باجی میں آپا افسانے کی طرح جنسی جبلی خواہشات ہیں جو اندر ہی اندر سلگتی ہوئی آگ بن جاتی ہیں۔

افسانہ مہندی والے ہاتھ میں ممتاز مفتی نے جنس اور لاشعور کو موضوع بنایا ہے۔ اس کہانی کا مرد کردار "مہندی" سے نفرت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہندی کا رنگ اور خوشبو در پردہ کہیں نہ کہیں لاشعوری حقائق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

یہ جنسی جبلت بعض اوقات بچپن میں مفقود ہو کر جوانی میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس افسانے میں بھائی جان کا کردار بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے جو بظاہر مہندی کی خوشبو اور انگوٹھی کے لیے نفرت کا اظہار کرتے ہیں تاہم پس پردہ اس کے لاشعوری محرکات کسی اور ہی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات نفسی کیفیات تکمیل کو نہیں پہنچتیں اور معاشرتی اور تہذیبی قدریں رُکاوٹ بنتی ہیں۔ شعور اور لاشعور کی یہ جنگ انسان

کو نئی ذہنی صورتِ حال سے دوچار کرتی ہیں۔ایسے میں انسان کی ذہنی کش مکش کی نئی صورت سامنے آتی ہے، کیوں کہ انسان کا بنیادی تعلق خارجی زندگی اور ماحول سے ہوتا ہے۔بیرونی طاقتوں کو قبول کرتے ہوئے زندگی گزارنے کے لیے لاشعوری خواہشات کو پیچھے دھکیلنا ہوتا ہے۔اس ذہنی تضاد اور کش مکش کا نتیجہ بعدازاں نفرت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔یہی صورتِ حال مفتی صاحب کے افسانے مہندی والے ہاتھ میں ہمیں نظر آتی ہے:

> بھائی جان چُپ چاپ کرسی پر بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔آصفہ پہلے تو دیر تک کرسی کے پیچھے کھڑی رہی۔پھر اس نے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھوں کے سامنے کر دیا اور بولی "میرا ہاتھ دیکھیے بھائی جان" نہ جانے مہندی کی بھینی بھینی خوشبو یا اس کے شنگرفی رنگ کی وجہ سے بھائی یوں تڑپ کر اُٹھے گویا انھیں سانپ نے ڈس لیا ہو۔ان کی آنکھیں لال ہو گئیں۔مُنہ سُوج گیا۔جانے غصے سے کیوں انھوں نے تڑپ کر پیچھے دیکھا جہاں آصفہ لجائی ہوئی کھڑی اپنا آپ سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی..... مڑنے کی وجہ سے آصفہ کا ہاتھ ان کے منہ پر جا لگا۔انھوں نے وحشت سے وہ ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگے.....دیوانہ وار۔[10]

اس افسانے میں دوسرا کردار چھوٹی بہن کا ہے جو جنسی جبلت کا شکار ہے۔یہ نفسیاتی پہلوؤں کی طرف بھی ایک اشارہ ہے جس میں وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح ہاتھوں میں مہندی لگانے اور انگوٹھی پہننے کی خواہش مند ہے۔ لیکن بھائی کی اس عجیب و غریب نہ سمجھ میں آنے والی ذہنی کیفیت اور گھر والوں کے دباؤ کی وجہ سے ہمیشہ اس خواہش کو چوری چھپے پورا کرتی ہے۔اس میں بھی وہ صرف انگوٹھی کو چھپ کر پہنتی کیوں کہ مہندی والے ہاتھ کو چھپانا مشکل امر تھا۔اس لیے وہ اس آرزو کا ہمیشہ گلا گھونٹتی آئی تھی:

> اونہہ! بھلا انگوٹھی یا مہندی سے نفرت کرنا کون سی عقل کی بات ہے۔انگوٹھی میں پڑا کیا ہے۔نازک سی گول گول اور چمکیلی۔انگلی پر پہنی ہوئی کیسی پیاری لگتی ہے۔یوں بیٹھ جاتی ہے گویا پیار سے بغل گیر ہو رہی ہو اور رنگیلی مہندی اُف۔وہ ہلکی ہلکی خوشبو.....سفید شنگرفی ہاتھوں پر شنگرفی دھاریاں گویا دھنک آسمان سے ہاتھوں پر اُتر آئی ہو۔[11]

اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بہن نے بھائی کے اندر موجود انگوٹھی اور مہندی سے نفرت کی وجہ جاننے

کے لیے مارے تجسس کے اپنی کزن آصفہ کے ہاتھ پر مہندی لگادی۔ صبح آصفہ کے ہاتھ انگارے کی طرح چمک رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی خواہش کی یوں تکمیل کر کے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

یہی وہ لاشعوری اور جبلی خواہشات ہوتی ہیں جن کو پورا کر کے بچے یا بڑے اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ یہ خواہشات اور جبلتیں جب تکمیل پائیں تو فرد کے اندر متضاد سوچیں جنم لیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ جارحانہ انداز اپناتا ہے۔ بعض اوقات یہ جذبے انتہائی درجہ کی نفرت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ انسانی نفسیات کو سامنے رکھا جائے تو یہ سب نفسی جبریت کی طرف بھی ایک اشارہ محسوس ہوتا ہے۔

افسانہ چـــــپ میں عورت کے ایسے لاشعوری محرکات کو پیش کیا گیا ہے جو عام طور پر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے ایک شادی شدہ عورت کی کہانی کو بیان کیا ہے جو اپنی جنسی تسکین کے لیے نگاہِ غلط کو استعمال کرتی ہے اور چوری چھپے جنسی کھیل رچاتی ہے۔ ایک ایسا عمل جس سے مردوں کو لبھایا جائے اور لذت حاصل کی جائے۔

جیناں ایک بے باک اور جرأت مند عورت ہے جو اپنی شوخ، چنچل اور رنگین طبیعت کی وجہ سے کم عمر نوجوانوں کو لُبھا کر جنسی تقویت حاصل کرتی ہے۔ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے نوجوان کے قدم بہکانا آسان ہوتا ہے اس لیے جیناں نے قاسم کو بھی ایسی عجیب و غریب حرکات و سکنات کی وجہ سے اپنی طرف ملتفت کیا۔ پھر جب جیناں اکیلی رہ جاتی ہے تو مسکرا کر پوچھتی ہے:

> کیا دیکھتے رہتے ہو تم قاسی، میں میں، نہیں تو وہ گھبرا جاتا اور جیناں ہنستی مسکاتی اور پھر پیار سے کہتی "کسی کے سامنے یوں پاگلوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے ہوں۔ اگرچہ اکیلے میں بھی جیناں کا پائنچہ اکثر اوپر اُٹھ جاتا اور دوپٹہ بار بار چھاتی سے یوں ڈھلک جاتا کہ سانٹل میں ملبوس اُبھار نمایاں ہو جاتے۔ [12]

قاسم جہاں اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ ہے وہیں وہ اس بات سے انہونی سی لذت محسوس کرتی ہے جو اس کے رگ وپے میں ایک برق کی طرح رواں دواں ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی نے اس افسانے میں جذبات کے اس خفیہ کھیل کو بہت خوب صورت مگر دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ قاسم جس نے ابھی عنفوانِ شباب میں قدم رکھا تھا وہ

اس لذت کے تسلسل کا خواہاں تھا۔ ادھر جیناں بھی اس کی خواہشات کو ہوا دے رہی تھی تاکہ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔

اس افسانے میں جہاں دو لوگوں کے پیار کو پروان چڑھتے محسوس کیا جاسکتا ہے وہیں معاشرے کے اطوار، روایات اور عادات وغیرہ کی عکاسی بھی خوب کی گئی ہے۔ جیناں کے خاوند کی خاموشی کا پہلو بھی اس میں بتایا گیا ہے۔ دوسری طرف محلے والوں کی "چپ" کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

محلے والوں نے پہلے اس چوری چھپے کی ملاقاتوں پر چہ مگوئیاں کیں، پھر طعنے کسے اور آخر میں یہ بات گویا اہم ہی نہ رہی بلکہ ایک عام بات بن گئی۔ لوگوں نے بھی خاموش تماشائی بن کر چپ سادھ لی۔ یہی وہ وقت تھا جب جیناں کو اس کھیل سے دل چسپی ختم ہو گئی۔ جیسے اس کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد ہو اور وہ ہر وقت موضوعِ گفتگو رہنا۔

اس افسانے کے کردار "جیناں" کا نفسیاتی حوالے سے جائزہ لیا جائے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک عورت کیسے جائز رشتے کو ناجائز کر کے جنسی تسکین حاصل کرتی ہے۔ لاشعور میں دبی ہوئی خواہشات اور جنسی جبلت کی تشفی وہ نوجوان لڑکوں کو ورغلا کر اور بہکا کر پوری کرتی ہے۔ بعد ازاں اپنے شکار کے بولنے یا بات کرنے پر لفظ "چپ" کہہ کر بہت سے سوالوں کے بن کہے جواب دیتی دکھائی دیتی ہے۔ جیسے اپنے جنسی جذبے کی تسکین حاصل کر کے بہت لطف لے رہی ہو۔

فرائیڈ کے نظریے کے مطابق یہ بات درست نظر آتی ہے کہ سماجی مسائل کا بہت زیادہ انحصار جنسی جبلت پر ہے۔ فرد کی جبلتوں، جنسی دباؤ، اعصابی تناؤ اور ذہنی الجھنوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جرم کرنے یا غلط اور منفی اقدامات کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ بعض لاشعوری اقدام جو تکمیل کے مراحل طے کرتے ہوئے سماج سے اختلاف کرتے ہیں وہ فرد کی ذہنی حالت اور ذہنی نشوونما کے گزشتہ تجربات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ وجہ غالباً یہی ہے کہ انسانی نفسیات میں بہ یک وقت پیار اور نفرت کے جذبے موجود ہوتے ہیں۔

عورت اور جنسی جبلتوں کے ساتھ ساتھ لاشعوری خواہشات کے حوالے سے موضوعات ہمیں ممتاز مفتی کے افسانوں میں تواتر سے ملتے ہیں۔ چپ بھی ایسا ہی ایک افسانہ ہے جس میں قاسم اور جیناں کی محبت، جنسی جذبے اور

لاشعوری خواہشات کا بیان کیا گیا ہے۔اس افسانے میں ممتاز مفتی نے اپنی بیتی ہوئی زندگی کی عکاسی جیناں اور قاسم کے کرداروں کے ذریعے کی ہے جس میں ایک ایسی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کی تمام زندگی کے پیچھے ایسے لاشعوری محرکات کارفرما ہیں جو اسے جنس کی لذت کی تکمیل کے لیے اُکساتے رہتے ہیں۔

چـــپ افسانے کے آخری حصے میں مصنف نے وہ تمام باتیں کہہ دی ہیں جو معاشرے کی "چپ" کی صورت میں سامنے آتی ہیں:

> دونوں کبھی ہنستے ہیں، کبھی روتے ہیں اور کبھی یوں دنگا کرنے کی آواز آتی جیسے کوئی کبڈی کھیل رہا ہو۔"پر مامی اپنا گھر والا موجود ہو تو یوں جھک مارنے کا مطلب تو چھوڑ اس بات کو میں کیوں چوری کا مزہ چوری کا۔ سر پر حرام چڑھا ہے۔ پر مامی! تو چھوڑ اس بات کو دلہن! تجھے کیا معلوم کیا مزہ ہے اس "چپ" میں اللہ بچائے۔اپنا فضل و کرم رکھے، پر میں کہوں یہ "چپ" کھا جاتی ہے کھا۔بس اب تو سمجھ لے آپ ہی۔[۱۳]

افسانے کے اس آخری حصے میں ممتاز مفتی نے جیناں کی نفسیات اور اس کے کردار کو واضح کیا ہے۔ مصنف کی تحریر کا یہی نمایاں وصف ہے کہ وہ بات کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔اس خوب صورت انداز میں عورت ذات کے کردار اور اس کے لاشعوری نفسی جذبات کی عکاسی صرف ممتاز مفتی کا ہی خاصا ہے۔ جیناں اور قاسم کے کردار کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر محبت میں پابندیاں اور مشکلات نہ ہوں تو مزہ اور رنگینی نہیں رہتی۔ عشق کی آگ کو بھڑکانے کے لیے ضروری ہے کہ جدائی اور وصال کے درمیان کی بے قراری اور بے چینی کو محسوس کیا جائے اور اس افسانے میں تو جیناں جائز کو ناجائز بنا کر جنسی لذت حاصل کرتی ہے جس سے اسے ذہنی آسودگی اور تشفی ہوتی ہے۔

بـــدماش افسانے کے ذریعے ممتاز مفتی نے ان خواتین کی جنسی خواہشات اور ذہنی کیفیات کو بطریق احسن پیش کیا ہے جو اپنی جنسی زندگی سے غیر مطمئن ہیں اور اس کی لذت اور رنگینی کو پانے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ آزماتی ہیں۔افسانہ بـــــدماش کا آغاز بھی جنسی ملاپ سے ہوتا ہے۔اس میں دل آرا کے کردار کے ذریعے عورت کی جنسی نفسیات کو بیان کیا گیا۔ کیسے ایک عورت اپنے جنسی جذبے اور اندر لگی آتش کو بھڑکاتے ہوئے دُکھ اور اذیت سے گزرتی ہے:

اس نے از سر نو کس جذباتی جوش سے رشید کو اُبھارا تھا۔ اس امید پر اپنی روح کی تڑپ عریاں کر دی تھی کہ شاید وہ ایسا طوفان بن جائے جو ساحل سے ٹکرا کر چکنا چور کر دے۔ لیکن ساحل کے قریب پہنچ کر وہ تموج گویا ریت کا تودہ بن کر رہ گیا تھا۔ جس میں کوئی ناؤ ٹھس ہوئی کھڑی تھی۔ اس سے اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ کر رو دے۔ [۱۴]

اس افسانے کا دوسرا اہم کردار رشید ہے جس کے ذریعے دل آرا اپنے اندر لگی آگ کو بجھانا چاہتی ہے لیکن رشید کا کردار جنسی خواہش میں ایسا ہے جیسے بغیر تیل کے دیا جل رہا ہو۔ اس میں جنسی خواہش مفقود ہے اسی لیے دل آرا کے لیے یہ چیز ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ شوہر کی طرف سے ناکامی کے بعد دل آرا اپنے گھریلو ملازم کے دوست شیرا کی گفتگو سُن لیتی ہے تو غیر ارادی طور پر باغیچہ میں جا نکلتی ہے اور شیرا زاسے دبوچ لیتا ہے اور دل آرا نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو شیرا ز کے حوالے کر دیتی ہے۔

اس افسانے میں ممتاز مفتی نے جس عورت کی کہانی بیان کی ہے وہ اپنی جنسی جبلت کے آگے بے بس ہے اور یہ جنسی خواہش اس قدر زور آور ہے کہ وہ شیرا ز جیسے مضبوط اور جنسی قوت کے حامل مرد کی قویٰ جنس کو ڈھیر کر دیتی ہے۔ شیرا ز اس حقیقت کا اظہار اپنے دوست کے سامنے بھی کرتا ہے:

یار حد ہو گئی۔ وہ سالی پورا بن تو یوں پی گئی۔ گویا شیرا نہ ہوا پانی کا گلاہوا۔ "ارے یار میں جو کہتا تھا وہ تو چُھٹی ہوئی بدماش ہے، "بدماش"۔ اچھا اب کے جو ملے تو۔ بھئی ساری عمر یاد نہ کرے تو میرا نام بھی شیرا نہیں۔ [۱۵]

انسان ہمیشہ اپنی لاشعوری خواہشات کو دبائے رکھنے کی کوشش میں رہتا ہے لیکن بعض اوقات وہ خواہشات اس قدر طاقت ور ہو کر سامنے آتی ہیں کہ فرد ان کی تکمیل کے لیے ذرائع تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بنیادی جذبات آسودگی چاہتے ہیں۔ اگر ان کی تشفی نہ ہو تو پھر دل آرا کی طرح نامکمل خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، اگر اس طرح سے بھی تشفی نہ ہو تو جنسی خواہشات اذیت بن جاتی ہیں جو صنفی الجھنوں کا باعث بن جاتی ہیں۔

ممتاز مفتی کا افسانہ گہر ائیاں بھی جنسی اور جبلی خواہشات پر مبنی جنسی افسانہ ہے۔ یہ کہانی ایک عورت

شہزاد کی زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی ہے جو ایک ادھیڑ عمر شخص کی چوتھی بیوی ہے۔ اس کی تربیت ایک مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ اس کا خیال ہے کہ جسم انسانی نجات کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اس افسانے میں عورت کا اضطراب اس کی بے چینی حد درجہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہے مگر دوسری طرف اس کی اچھی تربیت، اخلاقی اقدار اور معاشرہ اس کو اپنی لاشعوری خواہشات کی تکمیل میں رُکاوٹ ڈالتے محسوس ہوتے ہیں۔ ذہنی الجھنوں، بے چینیوں اور اضطراب کی یہ کیفیت اس کو مسلسل کچوکے لگاتی ہے اور لاشعوری عمل اس کو معاشرے کی بنائی ہوئی قدروں کے خلاف اُکساتا ہے۔ چنانچہ یہ عورت اپنی جبلی خواہشات کی تکمیل کے لیے چوری چھپے تسکین کے راستے تلاش کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ممتاز مفتی کے بہت سے کردار ایسے ہیں جن میں عورت کو انتہائی نڈر اور بے باک دکھایا گیا ہے جن کو خود نمائی اور زیبائش کا شوق ہے اور مردوں کو لبھانے اور ان کے جذبات کو بھڑکانے کا فن بہ خوبی جانتی ہیں۔ "شائستہ" افسانے میں بھی یہی کردار ہمیں نظر آتا ہے جو عورت کے فطری جذبے سے بھرپور ہوتے ہوئے اپنی چھپی ہوئی اور عیاں خواہشات کی تکمیل کے لیے عجیب اور دل چسپ انداز اپناتی ہے۔ انسانی جبلت کا بہترین تصادم ہمیں شائستہ اور سکندر کے رشتوں میں ملتا ہے۔ شائستہ اپنی جنسی جبلت کی آسودگی کے لیے غیر مردوں کے سامنے کچھ ایسی حرکات و سکنات کرتی ہے کہ اس کا شوہر سکندر جو کتابوں میں کھویا رہنے کا عادی ہے وہ شائستہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ کار کو اپناتے ہوئے شائستہ شوہر کی توجہ ملتف کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ سکندر کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شائستہ اپنے گھر آنے والے ہر مرد مہمان سے جان کر والہانہ انداز اپناتی ہے۔ اس کی چاہ اور بے تکلفی دیکھ کر اس کا شوہر اس پر توجہ دیتا ہے:

> بس جی میں نہیں پڑھا سکتا تمھیں۔ اب اسی سے پڑھا کرو۔ اپنے کرامت سے جس سے سارا دن خوش گپیاں ہانکتی ہو۔ میں نے ان کی طرف دیکھا آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ بس جی پھر کیا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس روز۔ پانی گرم تھا صرف ایک جوش دینے کی ضرورت تھی، صرف ایک۔ کس قدر چوکھا رنگ آئے گا چائے کا۔ میں نے سوچا۔ اس کے بعد میں نے کرامت سے اور بھی بے تکلفی شروع کر دی۔ [16]

جب سے شائستہ کو شوہر کی کمزوری کا علم ہوا تب سے اس نے اپنی دبی ہوئی خواہشوں اور دبی ہوئی امنگوں کو حاصل کرنے کا یہ انوکھا طریقہ کار اپنالیا۔ اس افسانے میں ممتاز مفتی نے مرد اور عورت کی نفسیات اور ان کی جبلی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے شائستہ کا بہترین کردار تخلیق کیا ہے۔ ایک ایسا کردار جو محبت اور توجہ پانے اور اپنی جنسی زندگی کی تسکین اور جذبوں کی پذیرائی کے لیے معصومیت اور چالاکیوں سے انوکھا کھیل رچاتی ہے اور اپنے مقصد کو پا لیتی ہے۔

ممتاز مفتی کے بہت سے افسانے ایسے ہیں جن میں موضوعات ایک سے ہیں مگر کہانی اتنی الگ ہوتی ہے کہ یکسانیت کا احساس بالکل بھی نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا نقطۂ نظر کون سی کہانی سے مماثلت رکھتا ہے۔ شرابی کا راز افسانہ بھی "شائستہ" افسانے جیسا ہے۔ اس میں مرد کردار کو تمام جنسی جبلتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مرد کی نفسیاتی حالت کچھ ایسی ہو چکی ہے کہ اس کو یہ یقین نہیں ہو رہا کہ وہ ایک خوب صورت اور حسین بیوی کا شوہر ہے۔ وہ چوں کہ شراب کا عادی ہے تو جب نشے کی حالت میں ہوتا ہے تو اپنی بیوی سے والہانہ محبت کرتا ہے۔ جب نارمل ہوتا ہے تو سوالات کے گرداب میں دھنس جاتا ہے۔ کیا اس کی خوب صورت بیوی اس سے خوش ہو سکتی ہے؟ کیا وہ ایک مکمل زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ اور اس جیسے کئی سوالات اسے غیر مطمئن رکھتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ اپنی بیوی کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی بیوی کی یہ خواہش ہے کہ وہ شراب پینا چھوڑ دے۔ مگر وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ اس کے شوہر کے نزدیک یہ عمل مشکل ہے۔ شراب چھوڑ دے مطلب بیوی کو پیار کرنا چھوڑ دے۔ یہ ممکن نہیں اسی اضطراب اور بے چینی میں وہ اپنی بیوی پر شک کرتا ہے اور خود ہی سوچتا ہے کہ وہ کسی سے چھپ کر ملتی ہو گی۔ یہ وہ راز ہے جس سے وہ اپنے دوست کو آگاہ کرتا ہے۔

ممتاز مفتی اس افسانے کے ذریعے شراب کے عادی مریضوں کے حالات بتاتے ہیں کہ کیسے نشے کا عادی انسان شک کی بنا پر اپنی ہستی بستی زندگی برباد کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر کا استعمال ممتاز مفتی کا نفسیاتی الجھنوں کا حامل افسانہ ہے ایک اور اہم افسانہ ہے۔ ڈاکٹر جو خود

راوی ہے اس کے مطابق ہماری نظروں میں حقیقت، خدا، مذہب کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ہم ان کو تصرف میں لاتے ہیں جو حقیقت کے ذریعے ہم قبل از وقت کر سکتے ہیں۔ خدا کو لیجیے؟ "خدا" کو بھی حسبِ ضرورت موڑ توڑ لیا جاتا ہے۔ مختلف سانچوں میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ مذہب کی مختلف تعبیریں تراش لی جاتی ہیں۔ محض ذاتی مفاد کے لیے یا اپنے یقین اور ایمان کی دنیا کو برقرار رکھنے کے لیے یا کسی ایسی ہی ذہنی الجھن کو چھپانے کے لیے ہم خود ساختہ تاویلیں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر حامد جو کہ تحلیل نفسی کا ماہر ہے وہ ایک ایسے شخص کی کہانی بتا رہا ہے جو اس کے کلینک پر علاج کے لیے آیا ہے۔ وہ شخص اپنی ذہنی الجھنوں سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ اس کے متعلق بات کرتے ہوئے ڈاکٹر حامد کا کہنا ہے کہ مریض بھی ڈاکٹروں کا استعمال ایک ٹوتھ برش کی طرح سے کرتے ہیں اور میں خود بھی ایک ایسے ہی نفسیاتی مریض کے ہاتھوں استعمال ہوا ہوں۔

ممتاز مفتی نے اس افسانے میں بھی شرابی کا راز والے موضوع کو لے کر بات کی ہے۔ جب بھی کسی شخص کو خوب صورت و حسین بیوی مل جاتی ہے تو وہ اپنی بیوی کو شک کی نظروں سے دیکھتا ہے جس کے بد اثرات اس کی خانگی زندگی کو اس حد تک متاثر کرنے لگتے ہیں کہ مرد و عورت دونوں بری طرح سے نفسیاتی پریشانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے کردار جا بجا نظر آتے ہیں۔

جہاں اس افسانے میں شکی مردوں کی نفسیات پر بحث ہوتی ہے وہیں ڈاکٹر کے استعمال کے متعلق بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ کیسے کیسے مرض میں مبتلا ہو کر اپنے لیے فائدے حاصل کرتے ہیں:

> زیادہ تر بیماریاں خود ساختہ ہوتی ہیں اور تقریباً ہر بیماری میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے مریض کو مرض کے ہونے سے بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کو ہی لیجیے ان کی بیماریاں عموماً کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہوتی ہیں۔ خاوند کو خوش رکھنے، نچانے، مٹھی میں لینے یا ٹالنے کے لیے یا ساس کی خفگی سے نجات پانے کے لیے، پڑوسیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اور تقریباً یہی حال بچوں اور بوڑھوں کا ہے۔[۱۷]

ممتاز مفتی نے ڈاکٹر کی زبانی ایک روایتی قسم کی عورت اور اس کے گھر بسانے کے حوالے سے روا رکھے جانے والے حربوں کو بیان کیا ہے۔ ہمارے معاشرے کی ہر عام عورت میں یہ تمام باتیں موجود ہوتی ہیں۔ ایک طرف عورت کے روایتی پہلو کو اُجاگر کیا ہے، اس کی نفسیات سے آگاہ کیا ہے تو دوسری طرف مرد کو اپنی بیوی پر کیے جانے والے شک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں کا ذکر ایک بیوی کی زبانی ہی کیا ہے۔ ایک شکی مرد کے ساتھ ایک وفادار بیوی کس اذیت اور تکلیف سے زندگی بسر کر رہی ہے:

> ہاں وہ طبعاً بے حد شکی ہیں۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح شک کی صورت پیدا کر لیتے ہیں..... وہ اپنے خیالی شک سے پریشان رہتے ہیں۔ اسی لیے میں بہت دُکھی ہوں..... حیرانی کی بات ہے کہ میرے میاں آپ ہی مجھے اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے پر مجبور کرتے ہیں اگر میں ان سے خندہ پیشانی سے نہ ملوں تو اُلٹا مجھ سے بگڑتے اور اگر ملوں تو میری چھوٹی چھوٹی حرکتوں اور باتوں کو موڑ توڑ کر کیا سے کیا بنا لیتے ہیں اور اُلٹا مجھ پر الزام دیتے ہیں... اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔[۱۸]

ممتاز مفتی کے پاس یہ فن ہے کہ وہ ایک ہی موضوع کو مختلف انداز سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کی کردار سازی کا فن دل کو موہ لیتا ہے۔ یہی ان کی خوبی ہے کہ وہ ارد گرد سے ایسے کردار لیتے ہیں جن سے وہ معاشی، معاشرتی اور تہذیبی عناصر کو بیان میں لا کر خوب صورت کہانی بنتے ہیں۔

دودھیا سویرا افسانے کا شمار ممتاز مفتی کے اہم افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہ فنی اعتبار سے نمائندہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں مفتی نے قاری کو مرد و عورت کے حسن اور آرائش و زیبائش سے باور کرایا ہے۔ کہانی کا آغاز روداد کی صورت میں ہوتا ہے جہاں ایک قبرستان کے باہر ڈھابے میں بیٹھے چار اشخاص اپنی اپنی زندگی کے واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے متعلقہ فرد اسی قبرستان میں مدفن ہیں۔

ممتاز مفتی نے مرد کرداروں کے ذریعے عورت کے مختلف روپ اور اس کی نفسیات کا بہت خوب صورت انداز میں جائزہ لیا ہے۔ عورت کے مختلف پہلوؤں سے اس کی خواہشات نفسِ لاشعور، جنس، کرب، محبت و نفرت غرض عورت کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں کا احوال اس افسانے کی خوبی ہے۔

کھدر پوش نوجوان کے ذریعے عورت کے حوالے سے کچھ اس طرح بات کی گئی ہے:

> آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ عورت کا وجود کتنا دبیز پردہ ہے جو ہماری عقل پر پڑا ہے۔ آج کی تہذیب اسے اور رنگین اور دبیز بنانے میں شدت سے مصروف کار ہے۔ اس جیتے جاگتے رنگین بھنور کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ وہ فرد کو لے ڈوبے اور اس کی کائناتی نگاہ کو ناکارہ کر دے، اسے زندگی سے بیگانہ بنادے، اُف کتنا عظیم پردہ ہے۔ ایسا پردہ جسے ہم بخوشی اپنی عقل پر ڈالنے کے مشتاق ہیں۔ کتنی بڑی رُکاوٹ ہے۔[19]

ممتاز مفتی نے عورت کے کردار کی مختلف پرتوں کو کھولا ہے۔ ان کے نزدیک مرد کی عقل پر پردہ عورت کے ہاتھوں پڑا ہوا ہے۔ ایک ایسا پردہ جو گزرتے زمانے کے ساتھ رنگین ہوتا جارہا ہے۔ دوسری طرف عورت کو ایک ایسے کردار کے طور پر دکھایا گیا ہے، جس کے بغیر منزل پر پہنچ پانا ممکن نہیں ہے۔ اس میں دودھیا سویرا ایک ایسی روشنی کی طرف اشارہ ہے جو روحانی ہے جس سے انسان کا باطن نکھر جائے۔ عورت کے وجود کا پردہ مرد کے راستے کی رکاوٹ ہے۔ جب یہ پردہ ہٹتا ہے تو فرد روحانی روشنی پاکر ہر طاقت حاصل کر لیتا ہے جس کے بعد سے زندگی بامقصد لگنے لگتی ہے۔ ذات کے گرد جھڑ جاتی ہے۔ سوچ کی کرنیں نکھرتی ہیں کہ تمام طرف نورانی سویرا پھیل جاتا ہے۔

جوار بھاٹا:

ممتاز مفتی کے افسانوں میں عورت اپنے مختلف روپ کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جوار بھاٹا بھی ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں عورت کے دو رُخ کا پتہ چلتا ہے۔ جو اپنے جسمانی تقاضوں کے سامنے بے بس اور مجبور ہے۔ وہ خود کو اذیت دے کر تسکین چاہتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ خود کو خاردار جھاڑیوں کے حوالے کر کے ان پر لوٹ پوٹ ہو۔ خود اذیتی کے عمل سے وہ اپنی جنسی آسودگی چاہتی ہے۔ معاشرہ یا سماج جن معاملات کی اجازت نہیں دیتا اور مرد اپنی خواہشات کی تکمیل میں سماج کو رُکاوٹ سمجھتا ہے۔ اس لمحے مرد کا ذہن جس ذہنی کش مکش سے گزرتا ہے اس کے نتیجے میں یا تو خواہشات لاشعور میں چلی جاتی ہیں۔ یا پھر بغاوت چور راستوں کا رخ ہے۔ ممتاز مفتی کا افسانہ چپ بھی اسی نوعیت کا افسانہ ہے، اس ضمن میں فرائیڈ کہتا ہے کہ "جو خیالات واحساسات اور ناآسودہ خواہشات لاشعور میں چلی آتی ہیں۔ وہ یا تو مکمل طور پر دبادی جاتی ہیں یا وہ اپنا اظہار مریضانہ اور کمزور طریقوں سے کرتی ہیں اور ہمیشہ بھیس

بدل بدل کر ظاہر ہوتے ہیں۔"[20] جس معاشرے میں فطری خواہشات سماج سے مطابقت رکھتی ہیں سماج کے دباؤ کے زیرِاثر جذبات کو روک کر اظہار کو ممنوع اظہار سے گریز کرتا ہے تو وہاں جنسی نفسیات کے مسائل سر اٹھاتے ہیں۔اس قسم کی خواہشات میں سب سے اہم جبلت جنس کی ہے۔ ممتاز مفتی نے عورت کے انہی جنسی مسائل اور جنسی نفسیات کے دباؤ کو اپنے افسانوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ہمارے معاشرے کی عورت کسی طرح ذہنی اور جسمانی آسودگی کی تکمیل میں جب سماج اور معاشرہ رکاوٹ بنتا ہے تو ایک عورت اس کے حصول کے لیے کیسے کیسے حربوں سے کام لیتی ہے۔

ایک طرف ممتاز مفتی "باجی" اور "آپا" کے کرداروں کو سامنے لاتے ہیں جو اپنے اندر آگ بھڑکائے عمر گزارتی ہیں اور دوسری طرف "جوار بھاٹا" کی مرجانہ جیسے کرداروں کو سامنے لاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ کردار آج بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔

مـــــاں افسانے میں ممتاز مفتی نے بچے کے ذریعے ماں کے جذبات بیان کیے ہیں۔ماں کی ممتا سے لبریز اور محرومیوں کے ساتھ تنہا زندگی گزارنے والی عورت کی کہانی جس کے لیے اس کا بچہ ہی اس کی آخری امید ہے۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنے بچے سے بہت محبت کرتی ہے مگر اس افسانے میں ماں اکیلے بنا شوہر کے زندگی گزار رہی ہے۔اس کا سہارا اس کا بچہ ہے۔اس کے لیے وہ محلے کے ہر بچے سے جھگڑتی ہے۔اپنے بچے کو شریف اور دوسروں کے بچوں کو چالاک اور مکار سمجھتی ہے۔

ایک حادثہ اس کے بچے کی جان لے لیتا ہے۔اس کے بعد اس عورت کی زندگی دردِ سر بن کر رہ جاتی ہے۔ ممتاز مفتی نے متوسط طبقے کی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ماں بیٹے کی محبت اور بچے کو کھونے کے دُکھ سے کس بری طرح سے ٹوٹ چکی ہے۔نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ماں کے نفس کو خوف کے جس شکنجے میں افسانہ نگار نے واقعتاً دیکھا ہے اس کے تخیل نے تخلیق کے ایک روشن لمحے میں اسی تسلسل میں خوف کو ایک واقعہ کی صورت میں دیکھ کر اسے اظہار کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔[21]

اس افسانے کا شمار ممتاز مفتی کے اچھے افسانوں میں ہوتا ہے۔ ماں کی بیٹے کی تئیں محبت والفت کو اُجاگر کرنے میں اپنی بصیرت کا ثبوت دیا۔ ماں بچے کی کمی کو محسوس کر کے ایک سرد آہ بھرتی ہے۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سر ٹکائے اُفق کی جانب کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی پنچھی پنجرے میں دم توڑ رہا ہو۔

غسل آفتابی میں ممتاز مفتی نے داڑھی کو علامتی انداز میں پیش کر کے معاشرے میں معزز اور صاحب عزت سمجھے جانے والے کرداروں کے نفسِ لاشعور میں موجود احساسات اور جذبات کی عکاسی کی ہے۔ ہر انسان فطری تقاضوں کے مطابق اپنی جسمانی ضرورت اور روح کی تسکین چاہتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ظاہر و باطن کی جنگ جیتنے کے لیے ہر حربہ آزماتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو تکمیل دیں اور اپنا بھرم بھی قائم ودائم رکھیں۔ اس افسانے کے مولوی صاحب کا کردار بھی ایسا ہی ہے:

> میں نے اپنے پیارے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ جیتا جاگتا..... گرمایا ہوا بدن..... میرا ہاتھ میری داڑھی پر جا رُکا..... دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے وہ داڑھی کوئی چادر تھی جو میں نے اوڑھ رکھی تھی۔ جو میرے بدن اور سوچ کے درمیان حائل ہو رہی تھی اور مجھے اپنے جسم کی جاننے سے روک رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مگر دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ اس داڑھی سمیت غسل آفتابی ممکن نہیں۔ [۲۲]

انسان کی خواہشات اور آرزؤں کی تکمیل کے لیے جو نفسیاتی کش مکش اور ذہنی الجھنیں ہوتی ہیں وہی اس افسانے کا موضوع ہیں۔ کیسے ایک شخص باوقار روپ میں معاشرے میں رہ رہا ہے مگر اس کے باطن میں اُمڈتا ہوا آرزؤں کا طوفان اسے کسی ایسے کام پر اُکسا رہا ہے جس کے لیے اپنے شعور اور لاشعور کے مابین فرق کے باوجود خواہشات کی تکمیل کر کے ذہنی آسودگی کا خواہاں ہے۔

"مورا" کم و بیش "غسل آفتابی" جیسا ہی کردار ہے جو باطنی کش مکش کا شکار ہے۔ اس افسانے کے ذریعے ممتاز مفتی نے معاشرے میں موجود ایسے افراد کو بے نقاب کیا ہے جو دوسروں کو نصیحت اور آپ میاں فضیحت کے مصداق ہیں۔ مولوی صاحب کا کردار اسی طرح کے قول و فعل میں تضاد لیے ہوئے ہے جو دوسروں کو ہر وقت اچھائی

اور برائی کا فرق سمجھاتے ہیں اور خود اپنے اندر کے جذبات اور احساسات کو چوری چھپے پورا کرتے ہیں:

> مولوی صاحب کی آنکھیں دیکھ کر کبھی کبھی مجھے خود شبہ ہوتا ہے گویا ان کی تمام تر شوخی ان کے چہرے کے اس چھائے ہوئے انکسار اور قناعت سے نکل کر آنکھ میں چھپی ہو۔ [۲۳]

اس افسانے میں ممتاز مفتی نے معاشرے کے دو رُخوں کا اظہار کیا ہے۔ مولوی صاحب جو مذہب کی علامت ہیں جنھیں معاشرے میں عزت و مقام حاصل ہے تو دوسری طرف ممتاز مفتی کا پسندیدہ کردار عورت کا کردار ہے۔ یہاں جو عورت کا کردار نظر آتا ہے اسے جنس کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ "بیگاں نامی عورت محلے میں اپنی بے حیائی اور بے باکی کی وجہ سے مشہور ہے جو ایک تنور پر روٹیاں لگاتی ہے۔ بیگاں خود بوڑھی ہے اس نے اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے اپنی بیٹی کو تنور پر بٹھالیا ہے:

> جو اپنے جال تلے دانہ رکھے سمجھ لو وہ ہار مان چکا "دانے کو چھوڑو، جال تو ابھی جال ہی ہے نا"۔ پر دوست دانہ نصیب کا ہے۔ آشاں کے آنے سے محلے کی اقتصادی زندگی میں انقلاب آگیا۔ [۲۴]

ممتاز مفتی کے افسانے مور کا موضوع بھی عورت اور جنس ہے۔ ایک ایسی طوائف عورت جو اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے حربے آزماتی ہے تو دوسری طرف مولوی صاحب کا کردار جو اپنی ظاہری اور باطنی کیفیت سے تضاد رکھتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ مورے کو غلاظت کا ڈھیر کہتے ہیں تو دوسری طرف صراطِ مستقیم کا سبق پڑھاتے پڑھاتے خود بھی اسی رستے کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ مورے کی بے حیائی اور گندگی سے بچنے کا درس دیتے ہوئے مولوی صاحب اچانک پینترا بدلتے ہوئے کچھ یوں اظہار کرتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ، کیا دنیا بذات خود غلاظت کا مورا نہیں۔ دیکھو پاکیزگی اسے نہیں کہتے جو دیا غلاظت کے بناہو بلکہ پاکیزگی وہ ہے جو غلاظت کے باجود قائم ہو۔

ہاں اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دنیا غلاظت کا مورا ہے۔ اس کے بنانے والے نے اپنے آدمی غلاظت سے ڈرانے کے لیے نہیں غلاظت صاف کرنے کے لیے بھیجے ہیں۔ یہی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم دوسروں کو گناہ کرتے دیکھتے ہیں تو "لاحول ولا قوۃ" پڑھتے ہیں اور جب اپنی نگاہ وہی گناہ کرے تو اس کے لیے حیلوں اور

حجتوں کا سہارا لے کر خود کو نیک اور پارسا ثابت کرتے ہیں۔ یہی قول و فعل کا تضاد مولوی صاحب کے کردار کا خاصا ہے۔

زندگی افسانہ جنسی جبلت کے غیر صحت مند رجحان پر لکھا گیا ہے۔ عطیہ ایک ایسے شخص کی بیوی ہے جو ہر وقت خود کو کتابوں میں مصروف رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی خوب صورت بیوی اس کے رویے سے اس قدر عاجز ہے کہ اسے گھر سے باہر ایک ہارمونیم بجانے والا شخص اس کے اور اس کے شوہر کے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے۔ عطیہ کا شوہر اس سے محبت تو کرتا ہے مگر تخیلاتی جس میں عملی انداز موجود نہیں۔ عطیہ کا کردار ایک ایسی عورت کے جذبات کی ناآسودگی کی کہانی پیش کرتا ہے جو شوہر کو محبت کی عملی تصویر کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ جبکہ اس کا شوہر خیالی اور افسانوی دنیا میں مگن رہتا ہے اور عطیہ کی کسی خواہش یا خیال کو موضوع کی طرح لے کر اس پر افسانہ لکھنا چاہتا ہے:

> میں پوچھتی ہوں اگر زندگی بذاتِ خود حسن سے بھری ہوئی ہے تو آپ حسن کو ان نیلی کالی جلدوں میں کیوں ڈھونڈتے ہیں۔" اور پروفیسر نے سر کھجاتے ہوئے کہا خوب..... کیسا اچھوتا خیال ہے خواب..... ہوں..... اب میں اس موضوع پر افسانہ لکھوں گا..... کیسا بلند خیال ہے۔[۲۵]

ایک ایسی عورت جو اپنی جنسی ناآسودگی اپنے احساسات اور جذبات کو کچلے جانے کے احساس کے بعد گھر سے باہر ہارمونیم کی دھن میں بہک کر ہارمونیم بجانے والے کو اپنے شوہر کی جگہ تصور کر کے اپنی جنسی آسودگی حاصل کرتی ہے۔ یہ افسانہ جنسی جبلت کی ترجمانی کرتا ہے۔

ممتاز مفتی کا افسانہ پل مرد و عورت کے مابین رشتہ اور ان کی تہہ میں چھپے نفسِ لاشعور کے محرکات کو رفتہ رفتہ ظاہر کرتا ہے۔ ایک ایسا مرد جو کسی غیر محرم عورت کو دیکھنا در خورِ اعتنا سمجھتا ہے، وہی جب اس کا ایک دیدار کر لیتا ہے تو پھر اپنی دلی تسکین کے لیے اسے چوری چھپے دیکھنے کے مواقع تلاش کرتا ہے۔ اس موقع کے حصول کے لیے ایسے علاقوں میں سرگرداں رہتا ہے جو اس کو ناآسودگی اور تشنگی سے دوچار کیے ہوئے ہیں۔

اس افسانے میں جہاں بیوی اور شوہر دونوں ہی ایسی باطنی کیفیتوں سے دوچار ہیں جو دل کی تشفی اور آرزؤں کی

تکمیل کے لیے موقع تلاش کرتے ہیں جبکہ رشتوں کی اساس بھی انھی کیفیتوں پر ہے۔ ممتاز مفتی نے شوہر و بیوی کے باطنی جذبات کو معنوی پیراہن میں ڈھال کر جذبوں کی تہ داری کو عیاں کیا ہے۔

عورت بطورِ کردار مفتی صاحب کے ہر افسانے میں جلوہ گر ہے۔ انھوں نے عورتوں کے باطنی جذبات اور جنس لاشعور کے محرکات کو پیش کرتے ہوئے ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ ممتاز مفتی نے عورتوں کے نفسیاتی مسائل کو اُجاگر کرنے کے لیے جو انوکھا اور نیا انداز اپنایا یہ ان ہی کا خاصا ہے۔

ممتاز مفتی کے فکری ارتقا کا مطالعہ دراصل ذہنی سطح کا مطالعہ ہے۔ انفرادی اور اجتماعی نوعیت کا یہ پہلو معاشرتی مشاہدے کے نتیجہ میں اخذ ہوتا ہے۔ ارد گرد کا ماحول کے بدلاؤ کا نتیجہ لکھاری کی سوچ کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ممتاز مفتی کی ذاتی زندگی اور معاشرتی تجربات اور مشاہدات نے ان کی تحریروں کو بھی متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات، گھریلو ماحول، عزیز و اقارب، معاشرتی رجحانات، سماجی تغیر و تبدل اور بالخصوص ان کے وائل عمری کے افکار نے ان کی تحریروں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں مختلف نوعیت کے فکری رجحانات ملتے ہیں۔ ان میں مفتی مغربی مفکرین خاص طور پر سگمنڈ فرائیڈ، ایلس، یونگ اور ایڈلر وغیرہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بعض فکری رجحانات ابتدا سے اختتام تک مصنف کی تحریروں میں موجود ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی کا متصوفانہ رجحان اور انسانی نفسیات کے پہلو اول تا آخر زمانہ ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں عورت کا کردار ہمارے معاشرے میں موجود ایسا کردار ہے جو خاموش بے آواز چپ چاپ اور ایسی خاموشی جس کی گھٹن صدیوں پر محیط ہے جو اس گھٹن کے خلاف صد بلند کرتا ہے۔ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت کے کرداروں کے ذریعے اظہار کیا۔ اس کی ذہنی پریشانیوں اور نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کی۔ ان کے افسانوں کی یہ انفرادیت اور عورت کے محرک کرداروں کی خاصیت انھیں دوسرے مصنفین میں نمایاں کرتی ہے۔

ان کے افسانوں میں عورت یا تو چپ چاپ راکھ میں چنگاری کی طرح ہے یا پھر شوخ و چنچل دعوت التفات دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں موجود نسائی دورُخی ان کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد سامنے آتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انسانی جذبات واحساسات کو ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق اور قربت کی وجہ قرار دیا ہے۔

ممتاز مفتی کی کہانیاں نفس لاشعور اور انسانی جبلتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار لاشعور میں جھانک کر تمام گمنام کاروائیوں کا ادراک کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے ہاں عورت ہمیشہ بطورِ موضوع سامنے آتی ہے۔ عورت کا کردار ان کے ہاں معاشرتی و سماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نفسیاتی و نظریاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان کے بہت سے افسانے نفس لاشعور کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ ان میں انسانی نفسیات کے الجھاؤ کا پہلو اور لاشعوری کیفیات فرائیڈ کے نفسِ لاشعور سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ممتاز مفتی کے پہلے دور کے بیشتر افسانوں میں انسانی جبلی خواہشات، معاشرتی دباؤ، رسوم ورواج کی پابندیاں، نفس لاشعور اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ عورت اور جنسی جبلتوں کے ساتھ ساتھ لاشعوری خواہشات سے متعلقہ موضوعات ہمیں مفتی کے ہاں تواتر سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مفتی نے مرد کرداروں کے ذریعے بھی عورت کے مختلف روپ اور اس کی نفسیات کا بہت خوب صورت انداز میں جائزہ لیا ہے۔ عورت کے مختلف پہلوؤں اس کی خواہشات، نفس لاشعور، جنسی جبلت، کرب و محبت، نفرت الغرض عورت کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں کا احوال ان کے افسانوں میں موجود ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز مفتی،مفتیانے،ص۶۷۔

۲۔ ایضاً،ص۹۔

۳۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۵۸۔۵۹۔

۴۔ ممتاز مفتی،مفتیانے،ص۱۷۔

۵۔ ایضاً،ص۲۷۔

۶۔ آصف حسن،سگمنڈ فرائڈ حیات و نظریات،ص۱۸۳۔

۷۔ ممتاز مفتی،مفتیانے،ص۳۶۔

۸۔ ایضاً،ص۶۰۔

۹۔ آصف حسن،سگمنڈ فرائڈ حیات و نظریات ،ص۱۵۸۔

۱۰۔ ممتاز مفتی،مفتیانے،ص۱۰۵۔

۱۱۔ ایضاً،ص۱۰۱۔۱۰۲

۱۲۔ ایضاً،ص۱۷۲۔

۱۳۔ ایضاً،ص۱۷۶۔

۱۴۔ ایضاً،ص۳۰۷۔

۱۵۔ ایضاً،ص۳۱۵۔

۱۶۔ ایضاً،ص۲۱۰۔

۱۷۔ ایضاً،ص۴۰۷۔

۱۸۔ ایضاً،ص۴۱۲۔

۱۹۔ ایضاً،ص۶۸۶۔

۲۰۔ آصف حسن،سگمنڈ فرائڈ حیات و نظریات،ص۲۶۳۔

۲۱۔ نذیر احمد،فکشن نگار:ممتاز مفتی(لاہور:دستاویز مطبوعات،۱۹۹۶ء،ص۲۰۰۔

۲۲۔ ممتاز مفتی،مفتیانے،ص۸۷۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۱۹۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۲۳۔

۲۵۔ ایضاً، ص۲۷۰۔

باب چہارم:

ساٹھ کی دہائی کے بعد کے منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا

باب چہارم:

ساٹھ کی دہائی کے بعد منتخب افسانوں میں تصورِ عورت کا ارتقا نفسیاتی نظریات کی روشنی میں

ممتاز مفتی کا افسانوی فن ابتدا سے ساٹھ کی دہائی تک مسلسل ارتقا پذیر نظر آتا ہے۔ یہ ارتقا اگرچہ موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے ایک تکمیلی صورت کی طرف بڑھتا نظر آتا ہے تاہم یہ ارتقا در اصل ان کے ہاں نفسیاتی ژرف نگاہی کا ارتقائی عمل ہے۔ چنانچہ ان کے کرداروں کی شخصیت اور فکر میں یہ نفسیاتی عوامل زیادہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ ان کی تحریروں میں سادگی اور سچائی ہو۔ ان کے افسانوں کا رُخ بدلتے ہوئے اب جنسیات اور نفسیات سے نکل کر سماجیت، تہذیبی و فکری اطوار اور مذہبی فکر لیے ہوئے ہے۔ اس حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں کہ:

> گذشتہ ۴۸ سال میں میں نے سینکڑوں کہانیاں لکھیں لیکن وہ کہانی نہ لکھ سکا جو میں لکھنا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک تحریر میں تاثر کو عطا سے تعلق ہے۔ حضرت دمڑی شاہ کی خدمت میں حاضری دی عرض کی "حضور آپ نے میاں محمود کو قلم عطا فرمایا تھا۔ کچھ مجھے بھی عنایت ہو جائے۔ دلّی میں حضرت نظام الدین اولیا کے در پر دُھائی دی تھی کہ حضرامیر خسروؒ کی جھولی بھری تھی۔ کچھ مجھے بھی دان کر دیجیے۔ اگر ان بزرگوں کی جانب سے عطا ہو جائے تو شاید مرنے سے پہلے میں وہ کہانی لکھ سکوں جو لکھنا چاہتا ہوں۔[1]

دوسرے دور کی تحریروں میں ہمیں مفتی صاحب کا یہی انداز دکھائی دیتا ہے جہاں ان کے موضوعات کے رُخ کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بدلاؤ ملتا ہے۔ ممتاز مفتی قاری کی نفسیاتی کیفیات پر اس مہارت سے کہانی بنتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یکسانیت کا ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوتا۔

روغنی پتلے کی کہانیاں جس زمانے میں لکھی گئیں اس دور میں ممتاز مفتی کی ذاتی زندگی میں بہت

بدلاؤ آ چکا تھا۔ ان تبدیلیوں کے اثرات ان کے فن پر بھی مرتب ہوئے۔ قدرت اللہ شہاب کے ساتھ بیتے زیادہ تر وقت نے ان کے ادب کو براہِ راست متاثر کیا۔ جس سے ان کے موضوعات نے ایک نیا رُخ متعین کیا۔ اس بدلاؤ میں ان کے بیٹے عکسی مفتی کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ اس حوالے سے خود ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

> میں نے چند ایک برس کے لیے کہانی لکھنا چھوڑ دیا۔ ہوا یوں کہ میرے بیٹے عکسی نے مجھے سنجیدگی سے کہا۔ "ابو کہانی لکھنا بند کر دیں".....اس لیے کہ آپ آج کل کی نئی نسل سے قطعی طور پر واقف نہیں ہیں۔ صرف "پراکسی" سے سمجھتے ہیں.....مجھے عکسی کی سوچ پر اعتماد تھا۔ ظالمانہ حد تک حقیقت پسند ہے۔[۲]

اس زمانے میں ممتاز مفتی نے خیالات اور احساسات کی نئی رو کی جانب قدم گامزن کرتے ہوئے اسلام آباد کی ثقافتی زندگی کا مشاہدہ شروع کر دیا۔ نوجوانوں کی زندگی پر غور و خوض کرتے ہوئے یہ جانا کہ آج کا نوجوان آزادی کا متوالا ہے۔ اس سفر کے لیے وہ مسلسل کاوش کرتا ہے لیکن بجائے اس کے کہ وہ آسودہ اور پُر سکون ہو اس کی زندگی اس سب کے برعکس بے چین اور غم زدہ ہے۔ یہی موضوعات کا نیا آہنگ مفتی صاحب کے افسانوں میں ابھرنے لگا۔

چند ایک افسانے جن میں سندرتا کار اکھشس، ان پورنی، اپسرا حوالی اور کھل بندھنا میں ہندی آہنگ کو اپنایا گیا ہے۔ باقی کی زیادہ تر کہانیاں نوجوان نسل کے بدلتے ہوئے معاشرتی اور تہذیبی رجحانات پر مشتمل ہیں۔ چند ایک کے علاوہ باقی تمام افسانوں میں معاشرتی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اب مفتی صاحب کا موضوع سماجی شعور اور لاشعور کے اندھیروں سے نکل کر اجتماعیت کے رجحان کو پیش کر رہا ہے۔ ان کی توجہ کا محور فرد کے ادراک سے ہٹ کر پورے معاشرے تک مرکوز ہو چکا ہے۔

کھل بندھنا اور سندرتا کا راکھشس میں ممتاز مفتی نے ہندو تہذیب و ثقافت کو موضوع بنایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب ہندو تہذیب و ثقافت سے کس قدر آشنا تھے۔ ان افسانوں میں جدید عورت کی اپنے حقوق کے تحفظ اور مرد کی برابری کا درجہ حاصل کرنے کی کاوش موجود ہے۔ مصنف نے ان افسانوں میں خالص ہندی اندازِ بیان کو اپنایا ہے جیسے لفظ "کلجگ" ہندی زبان میں اس کا مطلب ہے کہ ہندو مذہب کے

تصورات کے مطابق "کلجگ" میں برائیاں پوشیدہ ہیں:

> تپستی مہامان کا کہنا سچ ہو رہا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی۔ سیوا کارن کلجگ میں نہ استری رہے گی نہ ناری۔ صرف لڑکیاں رہ جائیں گی۔ ابلائیں۔ پھر ممتا کا دھارا سوکھ جائے گا۔ ناتے ٹوٹ جائیں گے۔ پرس اور ناری کا فرق مٹ جائے گا۔ ایک دوسرے کو پرکھنا مشکل ہو جائے گا۔[۳]

ہندو مذہب میں ماں کی ممتا کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ماں کی شفقت کا ختم ہو جانا اس بات کا اشارہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب برائیاں بڑھ جائیں گی۔ مرد و عورت میں امتیاز مشکل ہو گا۔ اس دور میں ایک دوسرے کی پہچان مشکل ہو جائے گی۔ اس افسانے میں مختلف کرداروں کے ذریعے سے عورت کے مقام و مرتبے کا بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کل جہاں کی تخلیق کی طرح عورت کی تخلیق کرنے والا بھی قادر مطلق ہی ہے۔ چاہے کسی ایک مرد کی آسودگی کا باعث بنے یا زیادہ مردوں کو آسودہ کرے۔ لذت کا سامان سمجھنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک عورت کے بند بند کو لہولہاں کر رہے ہیں۔ عورت اس بندھن کو توڑنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے، ایسی آزادی چاہتی ہے جو اس کا حق ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ عورت جس بندھن سے آزاد ہونے کی سعی کر رہی ہے وہ دراصل اس کی حقیقی خوشی اور دلی سکون کا باعث ہے۔ اگر عورت اس بندھن سے آزاد ہو جائے گی تو وہ عورت نہ رہے گی۔

ممتاز مفتی نے اس افسانے کے ذریعے آج کی جدید عورت کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اپنی کوشش ترک کر دے۔ بغاوت کی بجائے اپنی خوشی اور رضا سے مرد کو اپنائے اگر وہ مرد سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرے گی تو وہ کبھی بھی خوش اور مطمئن نہ رہ سکے گی۔ اس حوالے سے نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> افسوس تو اسی بات کا ہے کہ جدید طرزِ زندگی نے عورت کو اس کے عورت پن اور اس کی نسائیت سے محروم کر دیا ہے۔ وہ لڑکی بن کر رہنا چاہتی ہے ماں بن کر نہیں۔ وہ بندھنوں سے آزاد ہو جانا چاہتی ہے۔ پر نہیں جانتی عورت تو نام ہی بندھنوں کا ہے۔[۴]

ممتاز مفتی کے بہت سے افسانے ایسے ہیں جن میں جنس کو موضوع بنایا گیا ہے اور طوائف کا کردار تو بہت سے

افسانوں میں شامل ہے مگر ممتاز مفتی کے افسانوں میں جنس کی نوعیت اور انداز وہ نہیں جو منٹو کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ مفتی صاحب جنسی جبلت کو اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کر کے معاشرے میں موجود افراد کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ ان کے افسانے جنسی لذت کی بجائے ان کے حل کی ایک کوشش ہیں۔ ان کا مقصد پیچیدہ نفسیاتی مسائل کا حل ہے۔

افسانہ پرانی شراب نئی بوتل افسانے میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو جدید دور میں رہتے ہوئے بہت سی نفسیاتی پیچیدگیوں سے ہمکنار ہے۔ وہ ایک ذہنی اذیت اور کرب میں مبتلا ہے۔ اس افسانے کے کردار ایک وقت میں مختلف طبقوں کی نشاندہی کرتے ہوئے عشق و محبت کے حالات و واقعات، وضع قطع اور اندازِ گفتگو وغیرہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مشرقی و مغربی تہذیب کو اپنائے ہوئے ایسے کردار جو دو تہذیبوں کے ساتھ ساتھ دو زبانوں کا ملغوبہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے نئے دور کی پنپتی تہذیب کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

> گڈ لارڈ۔ ناٹ ممی۔ بھئی مجھ سے نہیں ہوتا کہ اپنے جذبات کی بھٹی کو ہوا دوں۔ دیتی رہوں دیتی رہوں اور جب بھانبڑ مچ جائے تو بیٹھ کر روؤں نو نو۔ آئی ایم ناٹ دی سابنگ اینڈ سائنگ ٹائپ۔ میں ہر حد کو توڑ سکتی ہوں صفو۔ دور جا سکتی ہوں لیکن اتنی دور نہیں کہ واپسی ممکن ہو جائے۔ لو لو لینڈ آف توریٹرن میں لے جاتی ہے۔ ہیو گیڈ ٹائم.....بٹ لو.....نو نو.....نیور.....کون ہے؟ لگتا ہے جیسے گلیکس بے بی ہو۔ گہرے بھورے بالوں کا اتنا بڑا تاج گول چہرہ۔ نکھرا رنگ اور آنکھوں میں لال ڈورے۔ صفو نے یوں سیتہ تھام کر کہا جیسے اندر ہل چل مچی ہو۔[5]

اس افسانے کا کردار نمی جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ اپنے ممی پاپا کی طرح بہت ماڈرن ہے۔ وہ افیئرز چلاتی ہے مگر محبت کرنے کی قائل نہیں۔ وہ محبت کو قید سمجھتی ہے اور اسے ایسا تعلق قبول نہیں جو اس کو ایک جگہ محدود رکھے۔ اس کا خیال ہے کہ محبت انسان کو مجبور اور بے بس کر دیتی ہے۔ اس کے نزدیک محبت بہار کے ساتھ خزاں بھی لاتی ہے جبکہ اسے صرف بہار ہی پسند ہے:

> محبت میں یہی تو عیب ہے شور و غوغا مچا دیتی ہے۔ دھول اڑاتی ہے راستے مسدود کر دیتی ہے۔ مواقع تباہ کر دیتی ہے۔[6]

خود کو محبت سے دُور رکھ کر صرف افیئرز چلانے والی لڑکی خود لاشعوری طور پر محبت کی نمود دل میں محسوس کرتی ہے۔ عشق جس میں کھونے اور پانے دونوں کا لطف ہوتا ہے۔ اس افسانے میں بھی یہ فکر پیش کی گئی ہے کہ جدید طرزِ حیات اور مادی ضروریات نے جہاں انسان کو مجبور کر دیا ہے، وہیں وہ ذہنی اور دلی آسودگی سے مفقود ہو چکا۔ وہ ایسے تذبذب کی کیفیت میں ہے جو اس کی زندگی کو آسائشوں کی بجائے مشکلات سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ یہی وہ پرانی شراب ہے جو جدید پیمانوں سے بھری چھلک رہی ہے۔ روغنی پتلے کے افسانوں میں ممتاز مفتی نے مرد اور عورت کے تعلق اور معاشرتی مسائل کو بہت گہرائی سے دیکھا ہے۔ ہندو تہذیب کی عورت اور مسلم تہذیب کی جدید عورت اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کا بیان ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تمام افسانوں میں جدید انسان کی اس تہذیبی شکست کی طرف اشارہ ہے جس سے آج کی نوجوان نسل دوچار ہے۔

اس مجموعے کے تمام افسانے بش اور بشریٰ، پکنک، ڈائری، آغا اور اسما رائیں، پرانی شراب نئی بوتل، روغنی پتلے، ہانٹڈ ہاؤس، وقار محل کا سایہ، حل کی دکان اس جدید اور قدیم انسان کے معاشرتی، سماجی اور تہذیبی بدلاؤ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

بش اور بشریٰ افسانے میں ممتاز مفتی نے ایک ایسے جدید معاشرے کی نشاندہی کی ہے جو ظاہری اور کھوکھلی نمود و نمائش میں اپنی اقدار سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس افسانے میں بش کا کردار ہے جو جدت کی طرف مائل ایک ماڈرن خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی کا کردار ہے۔ وہ وصال کی آرزو تو دور وصال کی کیفیت سے ہی ناآشنا ہے۔ اس کو رفتار سے محبت ہے اور ذولف بھی رفتار کا دیوانہ ہے۔ دونوں میں ہم آہنگی کا "نکتہ" "رفتار" ہے۔ اسی رفتار نے بش کو ذولف کا دیوانہ بنا دیا ہے۔ بش کو ذولف سے اس لیے محبت نہ تھی کہ اُسے ذولف سے عشق تھا۔ بش کا تعلق جس گھرانے سے ہے وہاں اولاد سے زیادہ اپنی سوشل زندگی اور اسٹیٹس اہم ہوتا ہے۔ ایسے ماحول کے نوجوان بچے محبت کے معاملات میں بھی زمانے سے الگ روش اور انداز اپناتے ہیں:

> جدید گھرانوں کا یہ عیب ہے کہ وہاں لو سٹوری جنم لینے میں تو بڑی بے تاب ہوتی ہے مگر پھلتی پھولتی نہیں یا شاید محبت میں عیب ہے کہ پابندیاں نہ ہوں تو چلتی نہیں۔ ختم ہو جاتی ہے، صرف سٹوری باقی رہ جاتی ہے اور یا وہ امیر بن کر اپنی عظمت کھو دیتی ہے۔ محبت میں انسان کے لیے محرومی لازم ہے۔ محرومی

شامل ہو جائے تو محبت عشق بن جاتی ہے۔ عشق انسان کو مادی دُنیا سے نکال کر نہ جانے کہاں لے اُڑتا ہے۔[۷]

دونوں گھرانوں میں عجیب طرز کا ماحول تھا۔ اس لیے ذولف اور بش کو پابندیوں کا سامنا نہ تھا۔ دونوں کو بہ آسانی ایک رشتے میں منسلک کر دیا گیا۔ دونوں کا عشق عجیب تھا۔ ذولف حرکت کا دیوانہ اور بش متحرک کی مداح ان دونوں میں تماشے اور تماشائی کا رشتہ تھا۔

افسانے میں نیا موڑ اس وقت آتا ہے جب رفتار کا دیوانہ ذولف حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا بیٹھتا ہے۔ بش کو اس حادثے سے صدمہ تو ہوتا ہے لیکن زیادہ دن تک وہ اس کیفیت میں نہیں رہتی۔ اس کی ہم جولیوں کا خیال تھا کہ اس کو اس حادثے کو خود پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے ذولف جیسے لڑکوں کی کمی نہیں۔ بش کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ کسی وہیل چیئر سے بندھ کر ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس تلخ حقیقت کے آشکار ہوتے ہی وہ ذولف کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنے کے دوران ہونے والی گفتگو کے بعد جس کیفیت سے دوچار ہوتی ہے وہ کیفیت اسے اپنے اندر بدلاؤ کا احساس دلاتی ہے:

> آدھی رات کو گویا کسی نے اسے جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی، کمرہ کسی کی موجودگی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ موجودگی بہت مانوس موجودگی تھی بش گھبرا گئی اس موجودگی کے احساس سے گھبرا گئی۔[۸]

یہی وہ وقت تھا جب بش کو محسوس ہوا جیسے اس کی ذات کے اندر سے ایک دھواں باہر نکل رہا ہے۔ اسے اپنی ذات میں زبردست تبدیلی کا احساس ہوا جیسے وہ لڑکی کے روپ سے عورت کے روپ میں بدل رہی ہو۔ ممتاز مفتی نے اپنے بہترین انداز نگارش اور معنوی انداز میں پیغام دیا ہے کہ تہذیبی روایات چاہے کتنی ہی بدل جائیں اور زمانہ جتنا بھی آگے بڑھ جائے مگر عورت کے اندر اپنے فطری جذبات اور فطری جبلت سے الگ ہونا ناممکن ہے۔

افسانے کے اختتام پر ممتاز مفتی نے عورت کے نفسیاتی ارتقا کو بش کے ذریعے کہلوایا ہے۔ جب وہ اپنے باپ کا سادو ٹوک انداز اپناتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ ذولف سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنا چاہتی ہے۔ اپنی منگنی توڑنے سے انکار پر اس کا باپ حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ میں نے ذولف سے شادی کا فیصلہ کیا ہے اسے میری ضرورت ہے

اوراب میں ایک ایسی سرزمین پر قدم رکھ چکی ہوں جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ان سب باتوں کے اظہار کے وقت باپ کے سامنے بش نہیں بشریٰ کھڑی تھی۔

یہی وہ عورت کا ارتقا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت چاہے جس مرضی ماحول میں پروان چڑھے اپنی اصل خصلت یعنی قربانی وایثار کے جذبوں سے الگ نہیں ہوسکتی۔ یہ خصوصیات اس کو قدرت نے عطا کی ہیں۔ عورت کا یہ حقیقی تصور ممتاز مفتی نے اپنے اس افسانے میں بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ممتاز مفتی نے ایک عام سے موضوع کو اچھوتے انداز میں پیش کر کے ایک بھرپور افسانہ تخلیق کیا ہے جس میں وہ عورت کے عظیم جذبوں کو ابھار کر سامنے لائے ہیں۔

دوسرے دور کے افسانے قدیم اور جدید کا امتزاج لیے ہوئے ہیں۔بش اور بشریٰ کی طرح کا افسانہ وقار محل بھی ہے۔ماڈرن لڑکی کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور ان خاندانوں کے اخلاقی زوال کو پیش کیا ہے۔اس افسانے میں مفتی صاحب نے اپنے خاص موضوع یعنی جنس کے تقاضوں کو نئے تجربات اور مشاہدات سے روشناس کرایا ہے۔جدید اور قدیم کے ظاہری اور باطنی تضادات کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

> جب وہ ہائی سکول پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ یاسمین دقیانوسی نام ہے۔اس سے پرانے زمانے کی بو آتی ہے۔ یہ نام ہے بھی سلوٹمپو۔ یاسمین۔ ڈھیلا ڈھالا جیسے چولیں ڈھیلی ہوں۔ لہٰذا اس نے یاسمین کی چولیں ٹھونک کر حبسِ من کر دیا۔ پھر جب وہ کالج میں پہنچی تو اسے پھر سے نام پر غصہ آنے لگا۔ .....میں کیا آرائش کی چیز ہوں۔ میں تو ایک ماڈرن گرل ہوں.....خوشبو نہیں ہوتی۔ یہ سب دقیانوسی چیزیں ہیں۔ماڈرن گرل تو ایکٹو ہوتی ہے سمارٹ ہوتی ہے.....جس پر زندگی بیتی نہیں بلکہ وہ خود زندگی بیتی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا نام جفی کر لیا۔ جفی۔ فٹ فٹاٹ۔ فوراً۔ یہ نام کتنا فعال تھا۔ کتنا سمارٹ اس میں زندگی کی تڑپ تھی۔ پھر اس نام کے زیرِ اثر جلد ہی اس میں یہ خواہش ابھری کہ کچھ ہو جائے۔[9]

اس افسانے کے ذریعے ممتاز مفتی نے ایسے گھرانوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو اپنی قدیم تہذیب اور روایت

سے بغاوت کرتے ہیں اور اپنی عزت و ناموس کو روندتے ہوئے اخلاقی پستی و زوال کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کا یہ افسانہ واقعاتی اور علامتی دو طرزوں کا حامل افسانہ ہے۔ اس حوالے سے مظہر الاسلام لکھتے ہیں:

> شان و شوکت اور شرافت کے پس پردہ نفسیاتی رویوں کی کشمکش اور پھر قدروں کا احترام ایک ایسی تکون ہے جو "وقار محل" میں پوری طرح نظر آتی ہے۔[۱۰]

بش اور بشریٰ میں ہمیں خیالات کا یہی تسلسل دیکھنے کو ملتا ہے۔ ممتاز مفتی کا یہ خاصا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے موضوع کو سمیٹتے ہوئے مشکل بات بھی بہ آسانی کہہ دیتے ہیں۔ مجموعہ روغنی پتلے کے تمام افسانوں میں تقریباً یہی موضوع، جدید اور قدیم کا امتزاج اور تہذیبی رویوں میں تضادات ہیں۔ ہندو اور مسلم معاشرے میں عورت کے کردار میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور تہذیب و روایات کے ساتھ جدیدیت کے رنگ نے عورت کو کیسے متاثر کیا۔ جنسی جبلت اور فطری جذبۂ حیات کی ایک مثال مفتی صاحب کا افسانہ اپسرا حویلی بھی ہے۔ اس افسانے میں زندگی پر طنز و تنقید کا رویہ اپنایا گیا ہے۔ اس میں مرد و عورت کے باہمی تعلق اور جنسیت کو لے کر کہانی کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسی عورت کا کردار دکھایا گیا ہے جو تمام معاشرتی و تہذیبی حدود و قیود سے فرار حاصل کرنے کے لیے خود کو بے لباس کر دینے تک سے گریزاں نہیں۔ عورت اپنی ذمہ داریاں چاہے بیوی ہو یا ایک ماں کے تمام کو در خواعتنا جانتی اور بغاوت کرتی نظر آتی ہے۔ ایک عورت جب خود کو فطری ذمہ داری سے آزاد کرواتے ہوئے بغاوت کرتی ہے تو وہ عورت کو حاصل رتبے اور مقام سے خود کو گرا دیتی ہے۔ ایک ایسا پھول بن جاتی ہے جو رنگ سے آنکھوں کو خیرہ کرے مگر اس کی خوشبو وفا کو معطر نہ کر سکے۔

نظریاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جو خود کو جبلی قید سے آزادی دلواتے ہوئے تمام حدود پار کر جاتے ہیں۔ ان کا مقصد اپنی تسکین ہوتا ہے۔ اس ذہنی آسودگی کے لیے وہ ہر روٹوک اور رکاوٹ کا بند توڑنے کی سعی کرتے ہیں۔ اگر جبلت عملی صورت کو آسودہ کرے تو ٹھیک ورنہ وہ فرد اس جبلت کے زیر اثر ذہنی اور جسمانی الجھنوں کا شکار ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اس کے اندر متضاد کیفیات اسے نفرت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور وہ خود اذیتی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں عورت جنس آزادی کی خواہاں ہے اس سے مرد کی صلاحیتیں متاثر ہو رہی ہیں۔ ہمیشہ وہ چیز زیادہ مغلوب کرتی ہے جو چھپی ہو۔ جو عریاں ہو کر سامنے آجائے وہ اپنا اثر کم کر

لیتی ہے اس سے تجسس ختم ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کی عورت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ نجیبہ عارف اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> فرائیڈ کی طرح ممتاز مفتی بھی جنس کو انسانی فطرت کا سب سے زیادہ قوی اور ناقابل تردید رجحان قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی جنسی جذبے کا تعلق محض ایک مخصوص فعل یا جنسی عمل سے نہیں بلکہ یہ افراد کی پوری زندگی میں جاری و ساری تخلیقی رو اور توانائی کا نام ہے۔ ممتاز مفتی کے خیال میں اس تخلیقی توانائی کا مثبت اور تعمیری مصرف تلاش کیے بغیر انسانی مسرت و نشاط کا حصول ممکن نہیں۔[11]

ممتاز مفتی کے افسانوی مجموعے سمے کا بندھن میں بھی کم و بیش موضوعات کا وہی تسلسل برقرار رکھا ہے جو ہمیں "روغنی پتلے" میں نظر آتے ہیں۔ جدید اور قدیم کا وہی تصور ہمیں یہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اسلوبِ نگارش، صنائع بدائع اور لفظی تراکیب میں ممتاز مفتی کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ سمے کا بندھن میں ہمیں ان کے لفظوں کی جادو گری کا احساس ہوتا ہے۔ سمے کا بندھن افسانہ مخصوص تہذیبی روایات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں مرکزی کردار ایک طوائف اور گائیکہ سنہرے کا ہے۔ مفتی صاحب نے سنہرے کی زندگی پر ایک سوال کیا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہی سوال سنہرے کی زندگی میں تبدیلی لے کر آتا ہے۔ تیرا جیون کس کام آیا؟ یہ تخیلاتی انداز پورے افسانے میں ساتھ ساتھ چلتا ہے، یہی سوال سنہرے کی زندگی میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے جواب کو پانے کے لیے اور مقصد کے حصول کی خاطر وہ اپنی پوری زندگی صرف کر دیتی ہے۔ اس افسانے میں سنہرے کی زندگی کے ادوار کو پیش کیا گیا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کا آغاز کیا۔

چٹ کبڑی کا شمار ان افسانوں میں ہوتا ہے جن میں نفسیاتی مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی عجیب انداز میں ان کا حل بھی نکالا گیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کے بیشتر کردار ایسے ہیں جو معاشی صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے ہمیں ذاتی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور الجھنوں کا حل بتاتے ہیں۔ یہ کردار تہذیب و روایات کی پابندیوں سے بغاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے تحلیل نفسی، جنس کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی حالات جیسے موضوعات کو بھی اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار میں یہ

خصوصیات ہوتی ہیں کہ وہ اپنے قاری کے ذہن پر ان مٹ نقوش مرتب کرے۔ ممتاز مفتی اس افسانوی گر سے اچھی طرح واقف ہیں۔

عینی اور عفریت استعاراتی انداز میں لکھے جانے والے اس افسانوں میں سے ہے۔ اس افسانے میں "عینی" کا کردار ایسا ہے جو من کے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے کی روح میں جھانکنے کی یہ صلاحیت اسے دوسروں سے منفرد بناتی ہے۔ اس نے اپنی باطنی کیفیات کو جب پوٹریٹ کی صورت میں کینوس پر اتارا تو وہ تصویر ایک عفریت نما دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ دکھی اور کانٹوں بھری زندگی کی طرف اشارہ ہے۔

کانٹوں سے بھری ایک ایسی تصویر جس میں تناؤ، تلخی اور محبت کی شدت اور مٹھاس مفقود ہے۔ ممتاز مفتی کا یہ افسانہ علامتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ زندگی کے تجربات سے اخذ شدہ نتائج کو بیان کرنے کا ایک انداز لیے ہوئے ہے۔ فرد کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی عمر ڈھلتی جا رہی ہے تو اس کے بنائے گئے "میں" کے پہاڑ میں ضربیں لگنے لگتی ہیں۔ جب کوئی اس "میں" کے بت کو توڑنے آتا ہے تو مختلف ذہنی کیفیات مسلسل کچوکے لگاتی ہیں۔ انسان "میں" کے بوجھ کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ جب یہ "انا" کا بت ٹوٹتا ہے تو گویا زندگی کا بوجھل پن ختم ہو جاتا ہے۔ سیاہ بادل چھٹ کر دودھیا سویرا نکل آتا ہے:

> میرا مطلب ہے کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں یا وہ ہوں جو لوگ مجھے سمجھتے ہیں..... آپ یہ ہیں یا وہ ہیں، آپ جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں..... اپنی مرضی کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھائے پھرتے ہیں۔ دفعتاً میں محسوس کرتا ہوں میرے کندھوں کا بوجھ گر گیا ہے۔ عین اس وقت! شفیع چلا کر کہتا ہے۔ "ارے یہ کینوس تو خالی ہے۔ میں پوٹریٹ کی طرف دیکھتا ہوں کینوس واقعی خالی ہوتا ہے۔[۱۲]

اس افسانے میں بھی زندگی کے خوب صورت لمحوں کی ڈھلتی ہوئی تصویر ہیں جن میں دکھ، تکالیف، اذیتیں، راحتیں اور تمام زندگی کی دلکشی موجود ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بہتے ہوئے دریا کی بجائے کوئی ٹھہری ہوئی پر سکون جھیل ہو یا پھڑکتی ہوئی آگ کی بجائے پر نور اُجالا ہو۔ محبت بھاگ دوڑ نہیں پُر سکون کیفیت ہے۔

افسانہ شادی المرگ میں ممتاز مفتی نے ایک ایسے گھرانے کو موضوع بنایا ہے جس میں مردوں کو کمانے کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی یہ کہانی دیارِ غیر میں زندگی گزارنے والے مرد کے گرد گھومتی ہے۔ ان کو درپیش مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ دشواریوں کی پروا کیے بنا صرف اپنے خواب کو پورا کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ان کے گھر والوں کو ان کی مشکلات کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ رحمت بی بی اپنے بیٹے طفیل کی کمائی سے گاؤں میں عالی شان گھر بنوانے کی خواہاں ہے تاکہ لوگ اس کو رحمتے کی بجائے رحمت بی بی پکاریں۔ وہ خود کو دوسرے اونچے گھرانوں کے برابر لانا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں وہ بھول جاتی ہے کہ غیر ملک میں کمایا گیا پیسہ کس قدر دشواریوں سے حاصل ہوتا ہے:

> جنھیں ہم اپنا کہتے ہیں انھیں کیا پتا کہ یہاں ہم پر کیا بیت رہی ہے۔ انھیں نہیں پتا یہاں خاڈم میں رہنے کا کیا مطلب ہے۔ انھیں کچھ بھی نہیں پتا ہو بھی جائے اسمٰعیل تو وہ نہیں کہیں گے۔ دفعہ کرو چھوڑو گھر آ جاؤ۔ یہاں روکھی سوکھی کھالیں گے۔ اونہوں! کبھی نہیں۔ وہ جوش میں آ گیا۔ اب روکھی سوکھی ان کے گلے سے نہیں اُترتی۔ [۱۳]

مفتی صاحب کا یہ افسانہ ایسے سماج کی عکاسی کرتا ہے جہاں غریبوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی معاشرے میں عزت و تکریم سے دیکھے جائیں۔ معاشرہ انھیں عزت و توقیر دے جو وہ علم و تعلیم اور شرافت سے نہ پا سکے۔ ایک ایسی عورت جو گھروں میں کام کرتی ہے اس کے بیٹے کے ولایت چلے جانے سے اسے جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ ان کو ٹوٹتا نہیں دیکھ سکتی۔ اس لیے بیٹے کی ڈاکٹر کی طرف سے نااہل ہونے کی خبر اور اس کی واپسی سے خوش ہونے کی بجائے مایوس ہو جاتی ہے جیسے اس کے خواب ٹوٹ گئے ہوں۔ ممتاز مفتی نے طنزیہ انداز میں معاشرے کی گھٹیا سوچ و فکر کو اُجاگر کیا ہے۔

ممتاز مفتی کے اس دور کے افسانے نفسیاتی مسائل کو دوسرے نقطۂ نگاہ سے اُجاگر کرتے ہیں جیسے پہلے وہ صرف جنسی مسائل، نفسیاتی اور تحلیل نفسی کے موضوع پر بات کرتے تھے۔ اب ان کی سوچ کا دھارا وسیع ہو کر فرد سے معاشرے اور سماج کی اجتماعی فکر و تخیل کا احاطہ کرتا ہے۔ مفتی صاحب نے اس دور کے افسانوں کے ذریعے انتہائی جرات مندانہ انداز اور حق گوئی سے معاشرے کی سوچ پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کے طنزیہ جملے کڑوا سچ اُگلتے ہیں۔

ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کو ایسا نیا رخ عطا کیا ہے جس میں معاشرے کی کمزوریوں اور خامیوں کو طنزیہ انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی مجموعہ کہی نہ جائے میں جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں بیش تر واقعاتی اعتبار سے کہانی کم اور مکالمہ زیادہ لگتی ہیں۔ اس مجموعہ کی زیادہ تر کہانیاں تجربات اور احساسات پر مبنی ہیں۔ اس حوالے سے مفتی صاحب خود لکھتے ہیں:

> ۱۹۴۳ء میں، میں نے اپنا پہلا مجموعہ "ان کہی" بڑے زعم سے پیش کیا تھا۔ میں دلوں میں چھپی ہوئی 'ان کہیاں' کہہ دوں گا۔ آج ۱۹۸۹ء میں میں اپنا آخری مجموعہ "کہی نہ جائے" پیش کر رہا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ "دل کی بات جو گھٹنے گھٹنے منہ تک آئے کہی نہ جائے۔"[۱۴]

ممتاز مفتی نے واقعی اس مجموعے کے بعد کہانیاں اور خاکے تو لکھے مگر کوئی افسانوی مجموعہ منظر عام پر نہ آیا۔ اس مجموعے میں چند کہانیاں ممتاز مفتی کے پسندیدہ موضوع سے متعلق ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ دیکھن دیکھن میں ایک شخص جو ظاہری انداز کا دلدادہ ہے مگر وہ باطنی کیفیات پر توجہ نہیں دیتا۔ حسنہ اور بنواری کے درمیان مکالمہ مصنف نے اس انداز سے تحریر کیا ہے کہ ان کی قدرتِ بیان پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے:

> بنواری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ تجھے مجھ میں کیا نظر آتا ہے؟ میں نے کہا۔ کیوں نہیں ہے وہ۔ تو۔ بولی صرف میں نے نہیں۔ کوئی عورت بھی وہ نہیں ہے جو دکھتی ہے، پر کیوں؟ میں نے پوچھا مجھے نہیں پتہ کیوں۔ عورت دکھن پر مجبور ہے۔ کوئی اس کے اندر بیٹھا ہے۔ کہتا ہے دیکھ، اکتائی ہوئی بیٹھی، خود کو نہ دکھا چاہیے۔ پھر بھی دکھنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ اور اکیلی بیٹھی ہو تو بھی زبردستی ہونٹوں پر مسکان آجاتی ہے۔[۱۵]

مفتی صاحب کے افسانے "اندر والی" میں عورت کے خارجی کرب واحساس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک ایسی طوائف کی کہانی ہے جو گھریلو زندگی بسر کرنے کی خواہاں ہے۔ ہر ایک کا دل لبھانے کی بجائے کسی ایک کی ہو کر جینے کی خواہش رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ گھر والی بن کر اپنے گھر والے کی خدمت کرے۔ اسی ایک کی ہو کر رہے۔ اس افسانے کے ذریعے ممتاز مفتی نے طوائف کے ظاہر و باطن کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے۔ انیس نامی شخص سے ملاقات کے وقت جب وہ سادہ انداز میں اس کے سامنے آتی ہے تو اس کے مُنہ سے سبحان اللہ نکل جاتا ہے۔ اس پر سناؤنی

اسے اس طرح جواب دیتی ہے۔ مرد اندر والی کو سبحان اللہ کہنا شروع کر دیں تو باہر والی چوکی میں راون بن کر نہ کھڑی ہو اور اندر والی گھونگھٹ نکالے نہ بیٹھی ہو۔ مرد قصور وار ہیں وہ باہر والی کو ڈھونڈتے ہیں اسی پر فدا ہوتے ہیں۔ جو مرد کے دل کو لبھائے گی وہی گھر والی بن پائے گی۔ افسانے میں طوائف کے کردار کے ذریعے عورت کی ظاہری اور باطنی خصوصیات، خیالات اور احساسات کو بیان کیا گیا ہے۔

ممتا کا بھید ممتاز مفتی کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک کے گرد گھومتا ہے۔ اس افسانے میں امنا کے کردار کے ذریعے سماج میں عورت کے مقام و مرتبے کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اگر عورت مرد کو متوجہ کرنے کے لیے ظاہری حسن اور رکھ رکھاؤ پر ہی توجہ دے تو اسے معاشرے میں وہ مقام اور عزت نہیں مل سکتی جس وقار اور عظمت کی وہ حق دار ہے۔ بیوی کا کام صرف شوہر کے شانہ بشانہ چلنا ہی نہیں بلکہ بیوی کی اپنی بھی کچھ خواہشات ہوتی ہیں۔

پہلے کی عورت در حقیقت مرد کی مرضی اور منشا پر خود کو نہیں ڈھالتی تھی مگر اب عورت نے مردوں کو لبھانے کے لیے اپنی مرضی ترک کر دی ہے۔ اب اگر مرد کو باوفا عورت پسند ہے تو عورت نے وفا اپنالی، اگر مرد ہر جائی پسند کرتا ہے تو عورت ہر جائی بن گئی ہے۔ ایسی عورتوں کو عورت نہیں ناری کہا جانے لگا ہے۔ عورت نے ناری ناری بنا کر اپنا وقار کھو دیا ہے۔ اس کو اصل عزت و عظمت ممتا کے جذبے اور مقام سے ملتی ہے۔ ممتا کے جذبے سے لبریز ہو کر ہی ایک عورت، عورت کہلا سکتی ہے:

> ناری بن کر عورت نے اپنی قدر گنوا دی ہے۔ عورت تو ممتا کے لیے بنی ہے جس میں ممتا جاگ اُٹھے وہ تو آپ محبت بانٹے گی وہ محبت کی بھیک کیوں مانگے۔
>
> .....یہ ممتا اسی کی دین ہے۔ اس نے اپنے نور سے ممتا کی ایک کرن ماں کو دان کر دی ہے۔[16]

اس افسانے سے ممتاز مفتی نے یہ سمجھایا ہے کہ مرد اور عورت کو سکون اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب عورت ممتا کے کردار کو اپنالے۔

افسانہ **دو ہاتھ** کا شمار مفتی صاحب کے مشہور افسانوں میں ہوتا ہے۔ اس کا موضوع مرد کی جنسی جبلت کے

حوالے سے ہے۔ یہ ممتاز مفتی کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> 'دو ہاتھ' اور 'شام نواسی' میں ہماری ملاقات اس پرانے ممتاز مفتی سے ہوتی ہے جو اپنی تخلیقی زندگی کے پہلے دور میں اپنے افسانوں میں بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔..... "دو ہاتھ" کا موضوع مرد کی جنسی کشش اور اس کے بڑے بڑے ہاتھوں میں مرکوز ہوتا ہے اور عورت کا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہونا ہے۔[۱۷]

ممتاز مفتی بلا کے حقیقت نگار واقع ہوئے ہیں۔ طنز و مزاح کے انداز لیے ہوئے سچائی کا پرچار کرنا ان کا ایک نیا پن ہے جو انھوں نے اپنے افسانوں کو عطا کیا ہے۔ فرد کو یہ سمجھانے کی سعی کی کہ زندگی دراصل زمانے کی تلخیوں اور کجیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کا نام ہے۔ سچ کی کڑواہٹ کے باوجود ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں تلخ حقائق کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے کے ذریعے افسانوی ادب کو یہ سکھایا کہ کیسے معاشرے کی بدعنوانیاں اور بدنظمیاں اُجاگر کرنی چاہئیں۔

ممتاز مفتی کے افسانے انسانی تعصب، اذیت، منافقت اور واقعات و حالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے معاشرے کی بدعنوانیوں، ریاکاریوں، دوغلے پن کو منظر عام پر لانے کے لیے منفرد اور نیا انداز فکر اپنایا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے ارد گرد جو لفظ اور آوازیں سنیں انہی کے ذریعے سے اپنی تحریروں کو مزین کیا۔ ایک عام فہم انداز میں اپنی بات کو قاری کے ذہن میں منتقل کیا۔

سوپوز کی کھڑکی افسانہ ممتاز مفتی کی سوچ کی کھڑکی کہا جاسکتا ہے۔ ایک نیا نظریہ جس کے ذریعہ وہ معاشرتی گھٹن، عناد و نفرت، خواہشات و جنسی نفسیات کا جائزہ لے کر ان کو اپنے افسانوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کی اکثریت راوی عورتیں ہیں۔ ان کے افسانوں میں نظر آنے والی خواتین، دلکش، مضبوط، منفرد، بے رحم اور نفسیاتی طور پر تحریک دیتی نظر آتی ہیں۔ عورت مرد کو زیر کرنے کے لیے حسن و زیبائش کے ہتھکنڈے آزماتی ہے۔ وہ مرد سے مساوات کی خواہاں ہے۔ ممتاز مفتی نے مرد کو عورت کے سحر میں گرفتار دکھایا ہے۔ اُن کے مطابق مرد عورت کو معاشرے کا ایک اہم جزو ضرور سمجھتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ وہ عورت کو محکوم بنا کر رکھیں۔ مفتی

صاحب کوایسی عورتیں پسند ہیں جو زیر کرتی ہوں۔" بدمعاش عورتیں" اس کی مثال ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں ایسے ایسے کردار اُبھر کر سامنے آئے جنھیں عام افسانہ نگار سوچتے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز مفتی کے بارے میں برملا طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اندر سے ایک عورت کی طرح سوچتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ جب بھی کسی عورت کا کردار تحریر کرتے ہیں تو خود کو اس عورت کی جگہ بٹھا لیتے اس طرح سے وہ اس کردار کے اندر رچ بس کر اس کے مسائل اور نفسیاتی و جنسی الجھنوں کو موضوع تحریر بناتے ہیں۔ آپـــا افسانے میں آپا کا کردار اس کی بہترین مثال ہے:

> ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں عورتوں کو بے پردگی کی طرف مائل نہیں کیا اور نہ ہی برقعہ پوش ہو کر گھر بیٹھے رہنے کی تلقین کی ہے۔ البتہ بے پردگی اور مخلوط معاشرے کے نقصان سے آگاہ ضرور کیا ہے۔[۱۸]

ممتاز مفتی نے عورت کو ہر ایک کی مرکزِ نگاہ بن کر اپنے وجود کے ہونے سے پیش آنے والے معاشرتی مسائل اور برائیوں سے بچنے کی طرف راہنمائی کی ہے۔ عورت کی نفسیات ممتاز مفتی کے افسانوں کا مرکزی موضوع ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے جنسی، سیاسی، معاشی، جذباتی اور نفسیاتی احساسات کے اندر چھپی ہوئی قدروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس ثقافتی اتار چڑھاؤ کی مثال "مینا کے پاؤں، گڑیا گھر، جوار بھاٹا اور "ریت کی لہریں" ہیں۔ ممتاز مفتی نے صحیح راستے کی رہنمائی کرتے ہوئے اپنے افسانوں کے ذریعے سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔ انھوں نے لوگوں کے مسائل کا حل بے عزتی اور توہین کی بجائے دوستانہ رویہ اپناتے ہوئے پیش کیا ہے۔ آج کے نوجوان کے مسائل، نفسیاتی پیچیدگیاں، کرب و اضطراب، خود اذیتی اور اسی طرح کے جنسی مسائل کا حل نت نئے طریقوں سے بتایا گیا ہے۔ مفتی صاحب نے نصیحت کر کے ناراض کرنے کی بجائے دوستانہ طریقہ کار اپناتے ہوئے مسائل کا حل بتایا ہے۔

مفتی صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کے مسائل و مشکلات، نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی پیچیدگیوں کو اپنے گہرے مشاہدے سے اُجاگر کرنے کی بہترین سعی کی ہے۔

جگن ناتھ ممتاز مفتی کے ان افسانوں میں شامل ہے جن کے ذریعے انھوں نے قاری کو خانگی زندگی کے

مسائل سے آشکار کرایا ہے۔ ایسے مسائل سے آگاہ کیا جو معاشرے میں موجودہ ہر دوسرے آدمی کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ یہ افسانہ انسانی نفسیات اور نفسیاتی مسائل سے روشناس کراتا ہے۔ ساس، بہو کے درمیان بیٹے یا شوہر کے حوالے سے پائی جانے والی رقابت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے گھریلو مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ کیسے ایک مرد اگر ماں کو دیوی کا درجہ دے رہا ہے تو دوسری طرف بیوی سے بھی محبت والفت کا اظہار کر رہا ہے۔ دونوں عورتوں کے حقوق کی پاسداری اور مقابلے کی جنگ اس کو سخت نفسیاتی الجھنوں کا شکار کرتی ہے۔

جس بہو کو اس کی ماں بہت چاہت سے بیاہ کر لائی اور اس کی تعریفوں سے نہ تھکتی تھی اب وہ اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ماں اور بیوی کی اس لڑائی سے رفیق اکتاہٹ اور بیزاری کا شکار ہوتا چلا گیا اور مشورے کے لیے بھگت کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے مسائل سن کر بھگت نے کہا:

> چاہے ماں کے کہنے سے گھر والی کو پیٹو۔ چاہے گھر والی کے کہنے پر ماں کو ڈانٹو۔ سب بیکار ہے بلکہ ایسا کیا تو چکی کے پاٹ اور زور سے چلیں گے۔ اور مہین پسو گے۔ دیکھو بابو۔ وہ بہو ساس نہیں، سوکنیں ہیں۔ ماں میں کجی ناری ہے۔ بیوی میں کجی ماں ہے۔ وہ بدل نہیں سکتیں۔ صرف ایک اپائے ہے۔ تم خود بدل جاؤ گے۔ جگن ناتھ بن جاؤ۔ نہ ماں کی بات پر کڑھو نہ گھر والی کی ہمدردی سے چھلکو۔ نہ اس کی سنو نہ اس کی سنو۔ اِدھر کاٹھ اُدھر کاٹھ بیچ میں بیٹھا جگن ناتھ۔ جگن ناتھ بننا بہت مشکل تھا۔ خود کو کاٹھ بنالینا۔ نہ لاگ نہ لگاؤ۔ لیکن میں جگن ناتھ بن گیا۔[19]

لاشعور اور شعور کی کش مکش سے انسان اندر ہی اندر ہیجان میں مبتلا رہتا ہے۔ ظاہری حالات وواقعات اور اپنے ظاہر و باطن کی الجھنیں سخت ذہنی اذیت کا باعث بنتی ہیں۔ یہی رفیق کے ساتھ بھی ہوا وہ گھریلو زندگی کے حالات سے پریشانی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ ایسے میں اس پر بھید کھلتا ہے:

> مجھ پر بھید کھل گیا کہ سکھ خوشی کا نام نہیں غم اور خوشی دونوں سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ دنیا کو بدلنا خیال خام ہے۔ خود کو بدلو۔ ذات کے حوالے سے نہیں، اللہ کی نظر سے گرد و پیش کو دیکھو۔ نہ لاگ نہ لگاؤ۔ لاگ لگاؤ نہ رہیں تو حسن ہی حسن نظر آنے لگتا ہے کانٹے میں بھی، پھول میں بھی۔[20]

گڑیا گھر افسانے میں مفتی صاحب نے فوضیہ کی نفسیاتی کیفیات اور ذہنی الجھنوں کے ذریعے سماج کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو آئینہ دکھایا ہے اور یہ آگاہی پہنچانے کی سعی کی ہے کہ انسان کو اپنی اصل حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے ورنہ حالات وواقعات ہمیں مشکل صورتِ حال سے دوچار کر دیتے ہیں۔ انسان کو انھیں دشواریوں اور کھٹنائیوں کا سامنا ہو سکتا ہے جو اس افسانے میں فوضیہ کو ہوا ہے۔

گڑیا گھر مجموعے کے دیباچے میں مسعود قریشی اس طرح لکھتے ہیں:

> ممتاز مفتی کے افسانوں کا موضوع جنس ہے، جنسی لذت اور ہوس کاری نہیں۔ وہ جنسی کشش کا تجزیہ کرتا ہے، جنسی اختلاط کی تفصیلات و جزئیات بیان نہیں کرتا۔ اس کے کردار جو ہر مردانگی یا جوہر نسوانیت سے متاثر ہوتے ہیں لیکن وہ ان کے ملاپ کی عریاں تصویریں نہیں کھینچتا۔ یہ بات اسے منٹو اور عصمت سے ممیز کرتی ہے۔.....اس کا دوسرا محبوب موضوع انسانی فطرت کا تضاد ہے۔ وہ مختلف اشخاص کے متضاد عناصر کا تقابل بھی کرتا ہے۔ اس کے افسانوں میں کرائسس اور نقطۂ عروج کہانی کے پلاٹ نہیں بلکہ کرداروں کے تضادات کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کی ایسی رنگینی اس کے کرداروں میں جھلکتی ہے اور ان کو ٹائپ بنانے کے بجائے انھیں منفرد افراد بناتی ہے۔[۱۷]

مفتی کا افسانہ ذاتی معاملہ روایت اور جدیدیت کے مابین کش مکش کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس افسانے کے آغاز سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا مرد کردار (عبدالصمد) اس کو ایک نیک اور حسن واخلاق کا مجسمہ دکھایا گیا ہے۔ جب عبدالصمد جدید رنگ کو اپناتا ہے تو اس کے تمام اخلاقی محاسن ایک الگ اور جداگانہ انداز لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ صمد کو اس کے والدین نے انتہائی محنت و مشقت سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ بہترین تعلیم کے بعد اس کو ایک جگہ بہترین ملازمت حاصل ہوئی لیکن وہ اپنی روایت سے علیحدہ نہ ہوا۔ اسے تمام قرض جو اس کے والدین نے اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے لیے تھے یاد ہیں اور اپنے بہن بھائیوں کی ذمہ داری کا بھی کلی طور پر احساس تھا۔ اس نے والدین کی پسند سے شادی کی۔ سلمہ اس کی چچازاد تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صمد کو یہ احساس ہوا کہ سلمہ ایک گھریلو عورت ہے۔ بنگلے میں شفٹ ہونے کے بعد بھی اس کے اندر سے روایتی عورت نہیں گئی وہ بیگم صاحبہ نہ بن سکی۔

انسان اپنی شعوری اور لاشعوری خواہشات کے ساتھ ہر وقت نبرد آزما رہتا ہے۔ یہی بات اس کو نفسیاتی دباؤ اور ذہنی الجھنوں سے دوچار کرتی ہے۔ صمد بھی اپنی لاشعوری خواہشات کو شعوری طور پر حاصل کرنے کا خواہاں رہنے لگا۔ سلمہ کی اچانک موت کے بعد اس کی زندگی میں خلا در آیا۔ اس کے دل میں چھپی خواہش یعنی اپنی چناؤ کی بیوی پھر سے عود آئی:

> ابھی وہ یہ خواب دیکھنے میں مصروف ہی تھا کہ مس انوری ہوائی کی طرح "شوں"..... سے اس کے حلقے میں داخل ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا..... اس سے صمد کے دل کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی تھی اور وہ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جو عورت اس قدر شدت سے اثر پذیر ہو کر آپ میں سوچنے کی ملکہ نہ رہے۔ اس سے محبت ہو جانا مرد کے لیے قدرتی امر ہے تو مختصر یہ کہ انوری سے صمد پر یہ قدرتی امر مسلط ہو گیا۔ [۲۲]

ممتاز مفتی کے افسانوں میں پیچیدگیوں اور دشواریوں کی بجائے صاف گوئی اور بے ساختگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعے انسانی تعصب، فریب، معاشرے کی ریاکاریوں جیسے موضوعات کو بے نقاب کیا ہے۔

مسعود قریشی لکھتے ہیں:

> مفتی کا بیان بصری خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ نہ صرف کرداروں کی حرکات و سکنات بلکہ ان کی سوچ کی تصویریں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ وہ شعوری اور لاشعوری جذبات و احساسات کی چابک دستی سے عکاسی کرتا ہے۔ [۲۳]

چار گوٹ مفتی صاحب کا ایسا افسانہ ہے جس کے ذریعے پسے ہوئے زبوں حال طبقے، غربت اور لاچاری سے ہمکنار بے بس لوگوں کے حالاتِ زندگی اور صحت مند اور خوش حال رہنے والے اعلیٰ طبقے کے حامل لوگوں کی زندگیوں کا تقابل کیا گیا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کے ذریعے نمائشی تکلفات کا ملمع اتار کر عورت اور مرد کی اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ ان کے کرداروں کو اجاگر کیا ہے۔

مسعود قریشی دیباچے میں لکھتے ہیں:

> مفتی کسی خاص فلسفۂ حیات کا پرچار نہیں کرتا۔ اس کا فن "اچھے" اور "برے" یا نیک اور بد فتوؤں سے ماورا ہے۔ وہ صرف مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے مشاہدے کے نتائج کو خلوص سے کرداروں کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اسے لیبلوں سے نہیں، حقیقتوں سے غرض ہے۔ اپنے تجربات و مشاہدات سے سیکھا ہے کہ انسان اپنی فطرت اور اصلیت سے جتنا دُور ہو جائے گا، اتنا ہی وہ جوہر انسانیت سے عاری ہو جائے گا۔[۲۴]

ممتاز مفتی نے محض تحلیل نفسی اور جنس کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ انھوں نے سیاسی اور سماجی صورتِ حال کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جس کے ثبوت کے لیے گڑیا گھر، ایک تھا بادشاہ، کھونٹ والا بابا، خدا بخش اور چار گوٹ کو پیش کیا ہے۔

مفتی صاحب نے اپنے افسانے آدھے چہرے میں کھل کر ہومیو پیتھی علاج کی بات کی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے ہومیو پیتھی اور ایلو پیتھی طریقۂ علاج کا موازنہ کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ ہومیو پیتھی علاج کے فوائد اور ایلو پیتھی طریقۂ علاج کے نقصانات کیا ہیں۔ اس طرح انھوں نے کہانی کا رُخ ایک نئے نکتہ کی طرف موڑتے ہوئے قارئین کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ عہد حاضر کا انسان کس طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہے۔

مفتی صاحب اپنے قاری کی دلچسپی کو مد نظر رکھ کر نئے نئے طریقے اپناتے ہیں۔ یہ جداگانہ انداز ان کی تحریروں کو منفرد بناتا ہے۔ مفتی صاحب اپنے اس طریقہ ہائے تحریر کے ذریعے بتانا چاہتے ہیں کہ آج کا انسان زندگی میں دو طرح کے نظریوں سے متصادم ہے۔

۱) انسان اپنی جڑوں سے جڑا رہ کر قدیم تہذیبی روایت کی پاسداری کرتا ہے۔
۲) ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر جدید طرز اور جدید تمدنی نظام کا پرچار کرے۔

ممتاز مفتی کی دوسرے دور کی تحریروں کا محور بھی جدید اور قدیم کا امتزاج ہے۔ مفتی کا حقیقت نگاری کا بیان ان کی بڑی خوبی ہے۔ اس کے ذریعے وہ جدید اور قدیم طرز کے موجد ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کی تلخیوں اور مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہی بہتر ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشی بدعنوانیوں اور سماجی

بد نظمیوں پر وار کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے منافقت، اذیت، تعصب، فریب، معاشرتی بد عنوانیوں جیسے موضوعات کو بے نقاب کیا ہے۔ مفتی کا یہ خاصا ہے کہ وہ ارد گرد کے نقوش کو اجاگر کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز سے نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کا اظہار کرتا ہے۔

اس حوالے سے فکر تونسوی مجموعہ چپ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "اس کا طرزِ بیان، لہجے کا سبک رفتار طنز اور ہلکے پھلکے فقرات کی چبھن اس کے نظریے کے ابھار کے لیے منفرد مقام رکھتی ہے۔ وہ صرف اسلوب سے لاشعور کے پتھریلے نظریات کو پگھلا سکتا تھا۔ اس نرمی اور چبھن اور سبک روی ہی سے اس کے گرد و پیش کے نقوش اجاگر ہو سکتے تھے جو نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کے اظہار کے باعث ظہور میں آتا ہے۔[۲۵]

ممتاز مفتی کے افسانوں میں زندگی اور معاشرے کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ قاری کی توجہ بہ آسانی مبذول کروا لیتے ہیں۔ انھوں نے انسانی نفسیات کو اندر سے باہر نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ جب دوسرے اردو مصنفین لاشعور کی گتھیوں کو سلجھانے کی جانب متوجہ بھی نہ تھے اس وقت مفتی صاحب نے تحلیل نفسی، جنسی گھٹن اور جنسی محرومیوں سے پیدا ہونے والے نفسیاتی مسائل کو سب سے پہلے اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعے اجاگر کیا۔ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ہماری ہاں نفسِ لاشعور اور تحت الشعور سے پیدا ہونے والے نفسیاتی مسائل اور تحلیلِ نفسی کی ایجاد کا سہرا ان کے پاس ہے۔ ایسے دور میں فرائڈ کے نظریات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا جب فرائڈ کے افکار ہمارے ہاں نئے نئے داخل ہو رہے تھے۔ مفتی نے فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہو کر ان تمام مسائل کو اپنے ہاں محسوس کرتے ہوئے اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین تک منتقل کیا۔

مفتی کے ہاں اقتصادی، تمدنی اور نفسیاتی شعور کے مسائل ملے جلے انداز میں نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خاص طور پر طبقاتی نفسیات کی خوب صورت انداز میں جھلکیاں ملتی ہیں۔ جنسی، سیاسی اور معاشی حوالے سے پیدا ہونے والے ثقافتی تغیر و تبدل کی مثالیں بھی ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔ مفتی کے افسانے سماج کے لیے ایک آئینہ ثابت ہوئے جس کے ذریعے قارئین کو صحیح راستے کی طرف راہنمائی ملتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز مفتی،مفتیانے، ص۷۶۷۔

۲۔ ایضاً، ص۷۶۸۔

۳۔ ایضاً، ص۸۱۳۔

۴۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۲۷۱۔

۵۔ ممتاز مفتی،پرانی شراب، نئی بوتل، صفحہ ۸۸۲۔

۶۔ ممتاز مفتی،مفتیانے، ص۸۸۴۔

۷۔ ایضاً، ص۷۸۳۔

۸۔ ایضاً، ص۷۸۶،۷۸۷۔

۹ممتاز مفتی،مفتیانے، ص۸۹۸۔

۱۰۔ مظہر الاسلام، "ان کہی باتوں کی تفہیم"، مشمولہ مفتی جی، ص۴۲۰۔

۱۱۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۱۷۷۔

۱۲۔ ممتاز مفتی،مفتیانے، ص۹۷۷،۹۷۸۔

۱۳۔ ایضاً، ص۱۲۲۷۔

۱۴۔ ایضاً، ص۱۰۴۶۔

۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۶۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص۱۱۲۹۔

۱۷۔ نجیبہ عارف،ممتاز مفتی کا فکری ارتقا،ص۳۰۹۔

۱۸۔ ریحان حسن،ممتاز مفتی حیات و ادبی خدمات،ص۱۵۳۔

۱۹۔ ممتاز مفتی،مفتیانے، ص۱۱۵۰۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۱۵۰۔

۲۱۔ ایضاً، ص۶۲۴،۶۲۵۔

۲۲۔ ممتاز مفتی،مفتیانے، ص۶۶۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص۶۲۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص۶۲۴۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۴۸۔

باب پنجم:

ماحصل

باب پنجم:

محاصل

ناول ہو، افسانہ ہو یا شاعری لکھنے والوں نے خواتین کے معاشرتی اور تہذیبی کردار کو موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے بات کرنے والوں میں مرد و زن دونوں ہی نے اپنی اپنی کاوشیں کیں جس کے ابتدائی نقوش قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی تحریروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک طرف مقامی حالات و واقعات تو دوسری طرف مغربی ادب نے بھی فکری اور اسلوبیاتی سطح پر لکھنے والوں کو متاثر کیا۔

مغربی ادب کی یہ روایت بعد ازاں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک اور فطرت نگاری کے رجحانات کی صورت میں سامنے آئی۔ فطرت نگاری کا رجحان انسانی فطرت کے ان پہلوؤں کا نمائندہ تھا جن کو مشرقی معاشرے میں جنس کا نام دیا جاتا ہے۔ مغرب میں ہنری جیمس اور جارج مور نے اس رجحان کو پروان چڑھایا۔

اردو ادب میں اس رجحان کے اثرات ابتدائی طور پر سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ہاں نمایاں ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُبھرنے والی تحریکوں نے فکری توانائی حلقے سے حاصل کی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے اولین افسانہ نگاروں میں نسیم حجازی، شیر محمد اختر، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر کا شمار ہوتا ہے۔ حلقے کے داخلی رجحان سے اردو افسانے میں فرد کے داخلی میلانات کو اظہار کی راہ ملی۔ نفسیات کے جدید علم سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا۔ بیشتر ادیبوں نے انسانی نفسیات کو افسانے کا موضوع بنا کر باطنی کیفیات کے سراغ لگانے کی کوشش کی۔ فنی سطح پر نفسیات کے علم سے حاصل ہونے والی تکنیکوں کا استعمال بھی پہلے ان ادیبوں نے ہی کیا۔

یوں تو مصنف کے خیالات و تصورات مختلف موضوعات کے گرد گھومتے ہیں مگر بات عورت کی ہو تو یہ ہمیشہ سے ہی ہر لکھنے والوں کا پسندیدہ موضوع رہی ہے۔ لکھنے والوں نے عورت سے متعلق اپنے احساسات و خیالات، جذبات اور تجربات کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ کوئی بھی نوعیت ہو چاہے مذہب، ثقافت، تہذیب و روایت، رسم و رواج، معاشرتی و معاشی رُکاوٹیں، نثر ہو یا ادب، معاشرتی استحصال ہو یا جنسی و نفسیاتی مسائل یا آزادیٔ نسواں الغرض عورت کو ہر موضوع کے حوالے سے زیرِ بحث لایا جاتا رہا ہے۔

مردوں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مرزا ہادی رسو، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ممتاز علی، احمد ندیم قاسمی اور احمد جاوید نے عورتوں کے حوالے سے مختلف موضوعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ ان تمام ادیبوں نے عورت کی استحصالی، جنسیت، حقوق کی پامالی، بنیادی حقوق کی سلبی کو موضوعِ تحریر بنایا۔ عورتوں کے حق میں سب سے زیادہ آواز خواتین لکھاریوں نے اُٹھائی جس کے ابتدائی نقوش محمدی بیگم، رشید جہاں، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، کشور ناہید، بانو قدسیہ، فہمیدہ ریاض، خالدہ حسین، پروین شاکر اور یاسمین راشد کے ہاں اُبھر کر سامنے آئے۔

جس دور میں عصمت چغتائی اور منٹو جنسیت کے حوالے سے بے باک اور کھلے انداز میں لکھ رہے تھے اسی زمانے میں ممتاز مفتی نے بھی عورت کی نفسیات، جنس اور تحلیل نفسی جیسے موضوعات پر قلم سرائی کا آغاز کیا۔ ممتاز مفتی اردو افسانے کا معتبر حوالہ ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا اہم گوشہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں تصورِ عورت کو ایک خاص زاویۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں ممتاز مفتی کے موضوعات اور اردو افسانہ نگاری کی روایت میں مفتی صاحب کی جو ارتقائی صورتیں سامنے آئیں ان کا حتی الامکان جائزہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد جن سوالات پر رکھی گئی تھی وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اردو افسانے میں تصورِ عورت سے کیا مراد ہے؟
۲۔ مختلف نفسیاتی نظریات اور اردو افسانے میں تصورِ عورت کے ارتقا کی کیا نوعیت ہے؟
۳۔ مغربی نفسیاتی نظریات کی روشنی میں ممتاز مفتی کے افسانوں میں تصورِ عورت بتدریج کس طرح ارتقا پذیر ہوا؟

ان سوالات کی بنیاد پر اس مقالے کو تحریر کیا گیا ہے۔ یہ تمام سوالات مد نظر رکھتے ہوئے بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ تمام کے جوابات تلاش کیے جائیں۔ اس ضمن میں تصورِ عورت کے ارتقائی پہلوؤں کے جائزے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ اردو افسانے میں تصورِ عورت کا پس منظر واضح ہو۔ اس حوالے سے پہلے باب میں تصورِ عورت کے بنیادی نظریات اور خیالات کو سمیٹا گیا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت کے ساتھ برتا جانے والا رویہ، عورت کا استحصال، مسائل و مشکلات اور اس کے بنیادی حقوق اور مختلف لکھاریوں کے موضوعات پر بحث کی گئی۔ اس میں یہ بھی

بتایا گیا کہ ممتاز مفتی کے ہم عصر افسانہ نگاروں نے کیسے ہندوستانی تصورِ عورت، عورت کا استحصال، جنسی اور نفسیاتی مسائل، معاشرتی بے حسی اور مظالم کو اپنے موضوعات میں شامل کیا۔

زندگی کے سفر میں ان تمام سطحوں پر منفی و مثبت عوامل سے سامنا ہوتا ہے۔ان عوامل میں، انسانی جبلتیں، جذباتی تقاضے، ذہنی و شعوری ترقی، گھریلو ماحول، دوست احباب، معاشی و معاشرتی پہلو شامل ہیں۔اسی طرح لکھاری مختلف نظریات سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا تعلق براہِ راست معاشرے سے ہوتا ہے مگر اس دور میں ہونے والی مختلف تحریکیں بھی متاثر کرتی ہیں۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں جو عورت ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے وہ ایسی عورت ہے جسے ہم سب معاشرے میں اکثر دیکھتے رہتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی نفسیاتی الجھنیں اور خاص طور پر عورت کے لاشعور میں پوشیدہ محرکات کو اُجاگر کیا۔ دراصل ممتاز مفتی فرائیڈ، ہیولاک اور ایلس سے متاثر ہیں اور ان کے زیرِ اثر ہی وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی باطنی پیچیدگیوں اور ان کے ارادوں کے جھلک دکھاتے ہیں۔ درحقیقت ممتاز مفتی نے جنسی کے بجائے اس کے پیچھے کارفرما عوامل کی جستجو کی ہے اور جنسی واردات کے بجائے پسِ منظر کو بیان کیا۔ مفتی صاحب نے جنس اور نفسیات کا تجزیہ کر کے اسے اپنے کرداروں کے ذریعے مسائل کو ابھارا۔ مفتی صاحب کے ہاں نفسیاتی بنی کا رجحان نہایت توانائی، فنی تکمیل اور جامعیت کے ساتھ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کا کام اپنے ہم عصروں سے منفرد دکھائی دیتا ہے۔

ممتاز مفتی نے جنسی کجرویوں کے لاشعوری محرکات کو علمی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ان کے افسانوں میں ہمیں جنس، عورت اور معاشرہ میں پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر جس قدر نظر آتا ہے دوسرے مسائل کا ذکر اس قدر نظر نہیں آتا۔ فرد کے اندر برپا ہونے والے داخلی طوفانوں کا نت نئی جہتوں سے تجزیہ کرتے ہوئے معاشرے کی کمزوریوں کو بیان کیا ہے جس سے معاشرتی زندگی اثر انداز ہوتی ہے۔ مفتی نے اپنے افسانوں میں جنسی نفسیات، معاشرتی حوالوں اور ان کے مختلف پہلوؤں کو کامیابی سے برتا ہے۔ ممتاز مفتی کا یہ الگ انداز ہے جو انھوں نے تحلیل نفسی، جنسی گھٹن، جنسی محرومی اور ان تمام کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کر کے اردو افسانوی ادب میں اضافہ کیا۔ شعور اور

تحت الشعور سے پیدا ہونے والے مختلف عوامل کو مفتی نے پیش کیا۔ تقسیم ہند سے متعلق افسانے ہوں یا نفسیاتی اور جنسی موضوعات لیے ہوئے مسائل سبھی میں وہ کامیابی سے ارتقائی منزلوں کی طرف گامزن ہیں۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں ہمیں نسائیت کے مختلف رُخ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے عورت کی فطرت سے روشناس کراتے ہوئے ان کے پوشیدہ اسرار کی نقاب کشائی کی ہے۔ انھوں نے اپنے مختلف افسانوں کے ذریعے معاشرے کی نہ جانے کتنی ہی عورتوں کی جبلت و فطرت اور کرب وازیت کی زندگی کو پیش کیا ہے جس کرب وازیت اور رنج والم میں وہ مبتلا ہیں۔

ممتاز مفتی کے افسانوں کی راوی بیشتر خواتین ہی ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی خواتین مضبوط، بے رحم، تحریک انگیز اور نفسیاتی طور پر محرک ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی عورت مرد کو زیر کرنے کے لیے حسن ونسائیت کے ہتھیاروں سے لیس ہوتی ہے۔ وہ مرد سے مساوات کی طلب گار ہے اور مرد کو عورتوں کے سحر میں گرفتار دکھایا ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں عورت کا ہر روپ نظر آتا ہے۔ بالخصوص بدماش عورتیں مفتی کو زیادہ پسند ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی بے پردگی کی جانب مائل نہیں کیا اور نہ ہی برقعہ پوش ہو کر گھر بیٹھے رہنے کی تلقین کی۔ البتہ بے پردگی اور مخلوط معاشرے کے نقصان سے آگاہ کیا۔ عورت کے شمع محفل بن جانے سے پیدا ہونے والی معاشرتی برائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

مفتی صاحب نے طبقاتی نفسیات کی جانب بھی توجہ دلائی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جذبات واحساسات اور لاشعور میں پوشیدہ قدروں کو چھیڑا جو جنسی، سیاسی اور معاشی حوالے سے تغیر و تبدل کا باعث بنتی۔ اس کی مثال مینا کے پاؤں، گڑیا گھر، ریت کی لہریں اور جوار بھاٹا میں ملتی ہے۔ انھوں نے نوجوان نسل کی زندگی کے نشیب و فراز، دکھ درد، اضطراب و کرب اور مسائل کو نت نئے طریقوں سے بیان کیا۔ ان کے ہاں اقتصادی، تمدنی اور نفسیاتی شعور اور بلاشبہ ذہنی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا تجزیہ جدا انداز میں ابھرا۔ ممتاز مفتی نے نفسیاتی نظریات کو پیش کرتے ہوئے اپنے گہرے مشاہدے کا ثبوت بہم پہنچایا ہے جس میں ان کا طویل تجربہ صاف نظر آتا ہے۔ مفتی صاحب نے نفسیاتی مسائل کی باریکیوں، جنسی محرومیوں کو ہر سطح پر واضح کیا۔ مفتی صاحب نے عدم جنسی تسکین سے متاثر افراد کے زخموں کو کریدا نہیں بلکہ مرہم رکھا ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں ایسے ایسے کردار ابھر کر سامنے آئے جنھیں عام افسانہ نگار سوچتے بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز مفتی کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ وہ اندر سے ایک عورت کی طرح سوچتے ہیں۔ وہ کردار کے اندر رچ بس کر اس کے مسائل اور نفسیاتی و جنسی الجھنوں کو موضوع تحریر بناتے۔ آپا افسانہ اس کی بہترین مثال ہے۔

ممتاز مفتی نے عورت کو ہر ایک کے مرکزِ نگاہ بن کر اپنے سے پیش آنے والے معاشرتی مسائل اور برائیوں سے بچنے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ طبقاتی نفسیات کا پہلو ان کے افسانوں کا خاصا ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعے جنسی، معاشی، جذباتی اور نفسیاتی احساسات کے اندر چھپی ہوئی قدروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کے مسائل و مشکلات، نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی پیچیدگیوں کو اپنے مشاہدے سے اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کو بحیثیت انسان پیش کیا گیا۔ مفتی صاحب کے افسانے صرف جنسی جرائم تک محدود نہیں بلکہ ان میں محبت مامتا، شیفتگی، دلربائی اور دوسرے نسوانی جذبات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں موجود جنس اور نفسیاتی رجحان کی جھلکیوں کے حوالے سے ان کا فن تکمیل پاتا ہے۔

اگر یوں کہا جائے کہ ان کے افسانوں میں فرد نہیں پورا معاشرہ اپنی برائیوں اور خامیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ مفتی صاحب نے موضوع اور اسلوب کے ذریعے اپنے افسانوں کو نئی جہت دی۔ انھوں نے فرائیڈ، ایڈلر، یونگ اور دوستوفسکی کے زیرِ اثر کئی افسانے تخلیق کیے۔ ممتاز مفتی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ وہ اپنے عہد کے انتہائی کامیاب اور نمایاں ادیب ہیں۔ ممتاز مفتی ماہر نفسیات بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فن میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

کتابیات

کتابیات

اجمل، محمد۔ اردو نظم میں تصورِ عورت۔ پی ایچ ڈی اردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، ۲۰۱۰ء۔

احمد، انور۔ اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔ اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء۔

احمد، نذیر۔ فکشن نگار: ممتاز مفتی۔ لاہور: دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۶ء۔

اختر، ش۔ اردو افسانہ میں لس بین ازم۔ گیاہ: کلچرل اکیڈمی، ۱۹۷۷ء۔

اختر، سلیم۔ افسانہ اور افسانہ نگار۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۱ء۔

اشفاق، حمیرا۔ مرتبہ۔ نثر رشید جہاں۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

جمیل، عصمت۔ اردو افسانے میں تصورِ عورت۔ پی ایچ ڈی۔ اردو۔ ملتان: بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ۱۹۹۸ء۔

جمیل، عصمت۔ نسائی شعور کی تاریخ۔ اردو افسانہ۔ اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

حسن، ریحان۔ ممتاز مفتی: حیات و نظریات۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء۔

حسن، آصف۔ سگمنڈ فرائڈ: حیات و نظریات۔ کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۵ء۔

درانہ، اسلم۔ مرتبہ مقدماتِ باغ و بہار۔ ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۰۔۳۳۹۔

زون، ایفرم۔ ابنارمل نفسیات۔ مترجمہ ذکیہ مشہدی۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے اردو، ۱۹۸۵ء۔

سعید، آنسہ احمد۔ کرشن چندر کے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

عارف، نجیبہ۔ ممتاز مفتی کا فکری ارتقا۔ پی ایچ ڈی اردو۔ اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۰۲ء۔

عارف، نجیبہ۔ بُکل دے وچ چور۔ لاہور: غزنی سٹریٹ، اردو بازار، ۲۰۱۲ء۔

عارف، نجیبہ۔ رفتہ و آیندہ۔ اردو ادب کا منظر نامہ۔ اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۸ء۔

قاضی، راشدہ۔ اردو افسانوی ادب میں خدیجہ مستور کا مقام۔ اسلام آباد: پاکستان مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

محمد، نیاز۔ڈاکٹر سلیم اختر بہ حیثیتِ نقاد۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء۔
مفتی، ممتاز۔ اسمارائیں۔لاہور: فیرز سنز،۱۹۹۳ء۔
مفتی، ممتاز۔اَن کہی۔لاہور: مکتبہ اُردو،۱۹۶۸ء۔
مفتی، ممتاز۔چُپ۔لاہور: مکتبہ اُردو،۱۹۴۷ء۔
مفتی، ممتاز۔گہما گہمی۔لاہور: مکتبہ اُردو،۱۹۴۹ء۔
مفتی، ممتاز۔روغنی پتلے۔راولپنڈی: مکتوبات حرمت،۱۹۸۴ء۔
مفتی، ممتاز۔سمے کا بندھن۔لاہور: فیروز سنز،۱۹۸۷ء۔
مفتی، ممتاز۔کہی نہ جائے۔لاہور: فیروز سنز،۱۹۹۲ء۔
مفتی، ممتاز۔گڑیا گھر۔کراچی: رائٹر گلڈ اشاعت گھر،۱۹۶۵ء۔
مفتی، ممتاز۔مفتیانے۔لاہور: فیروز سنز،۱۹۸۹ء۔
ملک، غلام اکبر۔عورت کا مقدمہ: اسلام کی عدالت میں۔لاہور: جنگ پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء۔